''ہندوستان کی آزادی میں مسلمانوں کا کردار'' پر بحث ونظر کا خاص شمارہ

بانی : حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ

مدیر : خالد سیف اللہ رحمانی

سہ ماہی مجلہ بحث ونظر حیدرآباد

شمارہ نمبر: ۱۳۳-۱۳۴ / ۳۳-۳۴	جولائی—دسمبر ۲۰۲۳ء	ذی الحجہ ۱۴۴۴ھ—جمادی الاول ۱۴۴۵ھ

مدیر

خالد سیف اللہ رحمانی

زرِ تعاون

اندرون ملک

ایک شمارہ: 50 روپے

سالانہ: 180، بذریعہ رجسٹری: 220

سہ سالہ: 500، بذریعہ رجسٹری: 600

بیرونِ ملک

ایشیائی ممالک کیلئے سالانہ: 20 امریکی ڈالر

یورپ، امریکہ، افریقہ کے لئے:

سالانہ: 30 امریکی ڈالر

ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتہ

Khalid Saifullah Rahmani, Baitul Hamd, H.No:16-182/1, Quba Colony, Po:Pahadi Shareef, Hyd. T.S 500005, Ph: 9989709240 E-mail: ksrahmani@yahoo.com

چیک/ڈرافٹ پر صرف: "Khalid Saifullah" لکھیں

کمپیوٹر کتابت وسرورق: القلم گرافکس، حیدرآباد ، فون نمبر: 7659841514

فہرست مضامین

● افتتاحیہ	:	مدیر	۳
● بھارت کی پہلی اسلامی تحریک؛ تحریک سید احمد شہیدؒ	:	مولانا نوشاد اختر ندوی	۶
● ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی	:	مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی	۱۳
● تحریک ریشمی رومال	:	مفتی شاہد علی قاسمی	۱۸
● تحریک خلافت (۱۹۱۹ء-۱۹۲۴ء)	:	مولانا محمد ناظر انور قاسمی	۲۴
● تحریک ترکِ موالات	:	مولانا محمد انصار اللہ قاسمی	۴۳
● ہندوستان کی آزادی میں علماء کا کردار	:	خالد سیف اللہ رحمانی	۵۱
● چند نامور مسلم مجاہدین آزادی	:	مولانا محمد انظر قاسمی	۶۲
● نواب سراج الدولہ	:	مفتی اشرف علی قاسمی	۷۵
● حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ اور ہندوستان کی جلاوطن حکومت	:	مولانا عبید اختر رحمانی	۸۲
● مہاتما گاندھی اور نمک ستیہ گرہ	:	مولانا محمد اسعد ندوی	۱۰۹
● ہندوستان کی تقسیم-اسباب ومحرکات	:	مولانا محمد ارشد قاسمی	۱۱۵
● تحریک آزادی میں اردو کا حصہ	:	مولانا محمد خالد ندوی	۱۳۵
● بھارت کے آئین کی تمہید برہمنوادی سامراجیت کے خلاف انقلاب کا عہدنامہ	:	مولانا احمد نور عینی	۱۵۲

○○○

بسم اللہ الرحمن الرحیم

افتتاحیہ

یہ مذہبی خوش عقیدگی اور مبالغہ آرائی نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے کہ گذشتہ چند صدیوں میں انسان کے حق آزادی اور مساوات و برابری کا جو تصور ابھرا ہے، وہ دراصل اسلامی تعلیمات ہی کا اثر ہے، اسلام جس وقت دنیا میں آیا اس وقت بادشاہت اور ملوکیت کا تصور ذہنوں پر چھایا ہوا تھا، اس وقت دنیا میں جتنی قابل ذکر حکومتیں تھیں وہ سب خاندانی بادشاہت کے نظام پر مبنی تھیں، ایران و روم کی حکومتیں اسی تصور پر قائم تھیں، ہندوستان اور چین میں بھی ایسی ہی چھوٹی بڑی ریاستیں تھیں، لوگ اس کے اس قدر خوگر ہو چکے تھے کہ جمہوریت اور آزادی کے تصور سے بھی وہ محروم تھے۔

یہ اسلام ہے جس نے انسانی وحدت اور تکریم آدمیت کا انقلابی پیغام دیا اور اس کو برت کر دکھایا اور آج پوری دنیا میں آزادی کے تصور نے جو تقویت پائی ہے وہ یقیناً اسی انقلابی فکر کی بازگشت ہے، انسانی وحدت کا تصور مسلم سماج میں ایک عقیدہ کی طرح رچ بس گیا تھا اور ایک معمولی سے معمولی انسان فرماں روائے وقت کے خلاف اپنی زبان کھولنے اور اپنا مقدمہ پیش کرنے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہیں کرتا تھا۔

حضرت انسؓ راوی ہیں کہ ہم لوگ حضرت عمرؓ کے پاس تھے کہ مصر کے ایک قبطی نے فریاد کی، آپؓ نے دریافت کیا تو اس نے کہا: عمرو بن العاصؓ نے مصر میں گھوڑ دوڑ کرائی، جس میں میرا گھوڑا آگے نکل گیا اور لوگوں نے اسے دیکھا بھی، مگر محمد بن عمرو بن العاص کہنے لگے کہ بخدا! یہ میرا گھوڑا ہے، وہ جب قریب آئے تو میں نے انھیں پہچان کر کہا کہ نہیں بخدا وہ میرا گھوڑا ہے، اس پر مجھے کوڑوں سے مارنے لگے، انھوں نے کہا کہ جانتے نہیں کہ میں ''ابن الاکرمین'' (شریف زادہ) ہوں۔

اس پر حضرت عمر نے اس سے کہا اچھا بیٹھو! پھر عمرو بن العاصؓ کو لکھا کہ میرا خط دیکھتے ہی تم اور تمہارے بیٹے محمد حاضر ہو جائیں، راوی کہتا ہے کہ عمرو بن العاصؓ نے اپنے بیٹے کو بلا کر پوچھا کہ کیا تم نے کوئی جرم کیا ہے؟ اس کے بعد وہ حضرت عمرؓ کے پاس حاضر ہو گئے، حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ہم حضرت عمر ہی کے

پاس تھے کہ عمرو بن العاصؓ کو ایک لنگی اور چادر میں آتے دیکھا، حضرت عمرؓ دیکھنے لگے کہ ان کا بیٹا بھی ساتھ ہے یا نہیں، جوان کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا، حضرعمرؓ نے مصری کو بلایا اور حکم دیا کہ درّہ لے کر ابن الاکرمین (شریف زادہ) کی خبر لو، راوی کہتا ہے کہ اس نے اسے اچھی طرح مارا، پھر حضرت عمرؓ نے کہا کہ عمرو کے سر پر بھی گھاؤ، کیوں کہ انھیں کے سہارے پر اس نے تمہیں مارا تھا، مصری کہنے لگا کہ میں مارنے والے کو مار چکا، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر تم انھیں مارتے تو میں بیچ میں نہ پڑتا، جب تک کہ تم ہی نہ انھیں چھوڑ دیتے، پھر فرمایا عمرو! تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنالیا ہے، حالاں کہ ان کی ماؤں نے تو انھیں آزاد جنا تھا؟ پھر مصری کی طرف متوجہ ہوکر کہا کہ اطمینان سے جاؤ، اگر کوئی بات پیش آئے تو مجھے لکھنا۔ (سیرت عمر لابن جوزی: ۹۷-۸۶)

دنیا نے بہت بعد کو آزادی کی لذت چکھی ہے، روس تو ۱۷۵۰ء میں بھی شکوہ سنج تھا کہ ''انسان آزاد پیدا ہوا تھا، لیکن وہ ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے'' یہ عجیب بات ہے کہ مغربی اقوام جو آج حقوق انسانی، حق آزادی اور جمہوریت کا سہرا اپنے سر باندھے ہوئی ہیں، نصف صدی پہلے تک انھوں نے ہی نصف دنیا سے زیادہ حصہ کو اپنا غلام بنایا تھا اور اب بھی دنیا کے بعض خطوں کو وہ اپنی نوآبادی بنائے ہوئے ہیں، ۳۰؍نومبر ۱۹۷۳ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے نسل پرستی کو قانونی جرم قرار دینے کے سلسلے میں ایک قرارداد منظور کی، تو چار ملکوں نے اس کی مخالفت کی اور حیرت کے کانوں سے سنئے کہ ان چار ملکوں میں جنوبی افریقہ اور پرتگال کے ساتھ امریکہ اور برطانیہ بھی تھے، یہ ہیں آزادی اور انسانی حقوق کے عالمی ٹھیکیدار!!

یہ ایک حقیقت ہے اور اس کا اعتراف کیا جانا چاہئے کہ خود ہمارے ملک ہندوستان میں آزادی کی لڑائی مسلمانوں نے شروع کی، ہندوستان کی جنگ آزادی جو ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک نوے سال پر مشتمل ہے، اس کا پہلا نصف حصہ یعنی ۴۵ سال زیادہ تر مسلمانوں ہی کی قربانی سے عبارت ہے اور اس عرصہ میں ملک کا کوئی چپہ نہیں جس کو مسلمانوں نے اپنے خون اور لہو کا نذرانہ پیش نہ کیا ہو، جنگ آزادی کا یہ حصہ جس میں سب سے زیادہ خوں ریزی اور تباہی و بربادی ہوئی، مسلمانوں کے مذہبی طبقہ کی قربانیوں اور فداکاریوں کی تاریخ ہے، سید احمد شہیدؒ، شاہ اسماعیل شہیدؒ، ان کے عالی ہمت خلفاء، علماء صادق پور، مولانا فضل حق خیرآبادیؒ اور کتنے ہی علماء و مشائخ ہیں جنھوں نے آزادی کی لڑائی میں جان و مال کی زبردست قربانیاں دی ہیں۔

اگلے پینتالیس سال میں جو مسلمان جنگ آزادی میں شریک ہوئے ان میں غالب اکثریت علماء

اور اہل دین کی تھی، خلافت کمیٹی، جمعیۃ علماء ہند، مجلس احرار وغیرہ تو قائم ہی اس مقصد کے لئے ہوئیں، افسوس کہ لوگ ان تحریکوں کو فراموش کر گئے، انھوں نے صرف کانگریس کو یاد رکھا، جو محض انگریز کی خوشامد اور ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان روابط کو پروان چڑھانے کی غرض سے قائم کی گئی تھی، ریشمی رومال تحریک اور ہندوستان کی جلاوطن حکومت میں بھی زیادہ حصہ علماء اور خصوصیت سے شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور ان کے شاگرد مولانا عبید اللہ سندھیؒ کا تھا، علماء اور مسلمانوں کے مذہبی طبقہ کی تحریک آزادی میں یہ پر جوش شرکت اور قربانی کچھ اس لئے نہیں تھی کہ ان کو آئندہ حکومت میں حصہ داری کی طمع تھی اور وہ وزارتوں میں اپنا حصہ چاہتے تھے، انھوں نے یہ سب کچھ تحسین وتعریف کی تمنا اور عہدہ اور مال وزر کی حرص وطمع سے آزاد ہو کر صرف اللہ کو راضی کرنے کے لئے کیا تھا؛ کیوں کہ وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ آزادی ہر انسان کا فطری اور پیدائشی حق ہے اور کسی قوم کو غلام ومحکوم بنالینا ایک ایسا ظلم ہے کہ اس کے خلاف آواز اٹھانا ''جہاد'' اور اس راہ میں اپنے آپ کو قربان کرنا ''شہادت'' ہے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت اور سچائی ہے کہ ملک کی آزادی میں مسلمانوں کا بہت بڑا حصہ ہے، اور مادرِ وطن کا چپہ چپہ ان کے خونِ شہادت سے لالہ زار ہے؛ لیکن اب ان کی قربانیوں کو فراموش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، افسوس کہ خود مسلمانوں کی نئی نسل بھی اپنے بزرگوں کی تاریخ سے نابلد ہوتی جارہی ہے، اس پس منظر میں ۱۲، ۱۳ ؍صفر ۱۴۴۵ھ مطابق ۳۰، ۳۱ ؍اگست ۲۰۲۳ء کو المعهد العالي الاسلامي میں ایک خصوصی دوروزہ سیمینار رکھا گیا تھا، جس کا عنوان تھا: ''تحریک آزادی میں مسلمانوں کا کردار''، اس سیمینار میں جنگ آزادی کے درمیان اٹھنے والی مختلف تحریکوں اور بعض اہم شخصیتوں کا تعارف پیش کیا گیا، اور معہد ہی کے اساتذہ نے اس میں اپنے مقالے پیش کئے، اس کے مجموعہ پر مشتمل بحث ونظر کا یہ خصوصی شمارہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے، بحمد اللہ یہ اس موضوع پر دستاویزی حیثیت کا حامل کام ہوگیا ہے، دعاء ہے کہ اللہ تعالی اس کو قبول فرمائے اور مسلمانوں کی نئی نسل کو بھی اپنے بزرگوں کی خدمات سے واقف ہونے کا جذبہ عطا کرے۔

وبالله التوفيق

خالد سیف اللہ رحمانی
(بیت الحمد، شاہین نگر، حیدرآباد)

۱۶ ؍شعبان المعظم ۱۴۴۵ھ
۲۷ ؍فروری ۲۰۲۴ء

بھارت کی پہلی اسلامی تحریک؛ تحریک سید احمد شہیدؒ

مولانا نوشاد اختر ندوی ❖

تحریک سید احمد شہیدؒ بھارت کی تاریخ میں ایک ہمہ گیر اور عظیم الشان تحریک ہے، اس پر لکھنے سے پہلے اس زمانے کی سیاسی مذہبی اور اخلاقی صورتحال کا بھی ایک جائزہ لینا ضروری ہے۔

سیاسی حالات

مغلیہ سلطنت کا شیرازہ مدت ہوئی بکھر چکا تھا اور پورا بھارت ایسٹ انڈیا کمپنی یا ان کے معتمدین اور حلیفوں کے تسلط میں تھا ملک کا بچا کھچا حصہ ان قسمت آزمائیسوں اور سرداروں کے ہاتھوں میں تھا جو یکے بعد دیگرے شکست کھا رہے تھے اور ملک حوالے کرتے جا رہے تھے شاہ عالم کے عہد میں سید صاحب پیدا اور جوان ہوئے شاہ عالم صرف نام کے سلطان تھے سید صاحب کی پیدائش سے ۲۲ سال پہلے ۱۷۶۵ء میں بنگال، بہار اور اڑیسہ بغیر کسی شریک کے ایسٹ انڈیا کمپنی کو دیے جا چکے تھے اور بنارس اور غازی پور بطور جاگیر کمپنی کو مل چکے تھے اب مغل سلطنت کے پاس صرف الہ آباد کا صوبہ اور آمدنی میں وہ رقم جو کمپنی ان کو دیتی تھی، رہ گیا تھا، ۱۷۸۸ میں غلام قادر روہیلے نے شاہ عالم کی آنکھیں نکال لیں اور اس انسان کو جو تیموری سلطنت کی عظمت وشان کا نشان اور اورنگزیب عالمگیر کا جانشین تھا سخت ذلیل کیا اس کے بعد ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک اپنی فوج لے کر دلی میں داخل ہوا اور مرہٹوں کو دلی سے نکال باہر کیا اور شاہ عالم کے جانشین اکبر شاہ جن کی تخت نشینی ۱۲۲۱ھ میں ہوئی ایک لاکھ سالانہ وظیفہ مقرر کیا گیا مغلیہ سلطنت نے بقیہ زندگی ایک وظیفہ خوار رئیس کی حیثیت سے گزاری جس کا ملک کے نظم ونسق اور سیاست میں کوئی عمل دخل نہیں تھا اور ان کا اختیار صرف قلعہ معلیٰ تک محدود تھا۔(۱)

کسی حکومت کا زوال کہنے کو تو ایک واقعہ ہے لیکن جب بھی کسی ملک وقوم پر یہ واقعہ پیش آتا ہے تو

❖ استاذ شعبہ مطالعۂ مذاہب: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

(۱) سیرت سید احمد شہید، ج:۱، ص:۶۵

سمجھئے قیامت ہی آتی ہے۔ جب حکومت کمزور ہوتی ہے تو سو فتنے سر اٹھاتے ہیں یہی حال اس وقت ملک کا تھا دکن سے لے کر دہلی تک کا علاقہ مرہٹوں اور جاٹوں کی لوٹ مار سے کراہ رہا تھا پنجاب سے افغانستان کے حدود تک سکھوں کا راج تھا جن کے ظلم و جبر سے شمالی اور وسطی حصہ بھی محفوظ نہیں تھا، بارہویں صدی ہجری کے آخر اور انیسویں صدی کے نصف تک یہی کیفیت تھی ملک میں ہر طرف بدامنی، انتشار وطوائف الملوکی کا دور دورہ تھا یہ وہ حالات تھے جس میں سید احمد شہید نے پرورش پائی اور جوان ہوئے۔(۱)

اخلاقی اور مذہبی حالت

اس وقت مسلمانوں کی اخلاقی صورتحال نہایت ابتر اور ناگفتہ بہ تھی۔ان کی سماجی اور معاشرتی زندگی اس درجہ خراب تھی کہ مؤرخ کا قلم بھی اس کی تصویر کھینچتے شرماتا ہے،فسق ومعصیت،شراب نوشی کی لت،نشہ آور اشیاء جیسے بھنگ،افیون،تاڑی وغیرہ کا استعمال جس سے نہ صرف اخلاق بلکہ صحت بھی خراب ہورہی تھی بازاری عورتیں دینی مجالس سے لے کر ہر مجلس کی زینت تھیں شرفاء اپنے بچوں کو ان کے پاس تعلیم وتربیت اور ادب سیکھنے کے لیے بھیجتے تھے بہت سے لوگ نکاح میں کسی تعداد بلکہ نکاح کے بھی پابند نہ تھے مسلمانوں سے فاتح اور زندہ قوموں کی خصوصیت رخصت ہوچکی تھی باوجود اس کے کہ یہ وقت مسلمانوں کے لیے بڑا نازک تھا امراء شرفاء اور غرباء تک عیش ونشاط میں مست تھے ہر دن عید اور ہر رات شب برات تھی تعیش وغفلت کا ایک نشہ تھا جس میں سب سرشار تھے۔(۲)

اس عہد میں مسلمانوں کی جو مذہبی حالت تھی اس کے تصور کے لیے موجودہ حالت ذہن میں لانا چاہیے ساتھ ہی یہ بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ اب جو صورتحال ہے وہ کوشش اور بڑی جدوجہد کے بعد ہے،اگر شرک جلی کوئی چیز ہے،تو وہ مسلم سوسائٹی میں موجود تھی،قبروں اور مردوں سے متعلق ایک مستقل شریعت بن چکی تھی سنت وشریعت بے معانی الفاظ تھے اور ہر بدعت،بدعت حسنہ تھی بہت سے حرام حلال ہو گئے تھے اور حلال حرام،اسلامی شعائر کی جگہ ہندوانہ رسم ورواج نے لے لی تھی قرآن ایک معمہ تھا جسے نہ کوئی سمجھ سکتا ہے اور نہ اس پر غور کرنے کی ضرورت تھی۔قرآن وحدیث کے بہت سے احکام منسوخ ہو گئے تھے مثلاً بیوہ کا نکاح،تقسیم میراث،فرائض وعبادات سے غفلت تھی اس لیے مقررہ مجلسیں اور بزرگوں کے کھانے،مرنے کے بعد قرآن خوانی،فاتحہ،قل،تیجا،سب سے بڑھ کر پیروں کا وسیلہ نجات کے لیے کافی تھا اس کے علاوہ کوئی مشقت حماقت

(۱) سیرت سید احمد شہید،ج:۱،ص:۶۸ (۲) حوالہ سابق

تھی ،صورتحال یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ سلام مسنون تک کی رسم بھی اٹھ گئی تھی ۔(۱)

یہ وہ سماجی ، مذہبی اور سیاسی حالت تھی جس کا بہت ہی اختصار کے ساتھ ایک خاکہ آپ کے سامنے پیش کیا گیا اسی عہد میں ماہ صفر ۱۲۰۱ھ میں حضرت مجدد سید احمد شہیدؒ کی ولادت ہوئی ۔

تکیہ رائے بریلی میں حسنی سادات کا مشہور خاندان آباد ہے ۔سادات کا یہ تکیہ، دائرہ شاہ علم اللہ کے نام سے بھی مشہور ہے سید صاحب اسی حسنی خاندان کے گوہر شب چراغ تھے آپ نے رسمی تعلیم کم پائی ،مشیت الٰہی کو کچھ اور کام لینا تھا۔معلموں نے لاکھ جتن کیے پر آپ کی طبیعت مدرسوں کی فرسودہ تعلیم کی طرف مائل نہ ہوئی اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ امی تھے ۔ جب آپ کی عمر ۱۲ سال ہوئی تو شفیق باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو روز گار کی تلاش میں لکھنؤ کا سفر کیا، اس سلسلے میں ایک مسلمان نواب کے ہاں کچھ دنوں قیام رہا پھر دہلی تشریف لے گئے اور حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا اور شاہ عبدالعزیز دہلوی کے دست مبارک پر بیعت کی یہ ۱۲۲۲ھ کا ذکر ہے اس وقت آپ کی عمر ۲۲/سال سے زیادہ نہ تھی دہلی کے اس پہلے سفر کے بعد آپ وطن لوٹ آئے اور دو سال وہیں قیام رہا اسی درمیان آپ نے نکاح بھی کیا۔(۲)

سید صاحب کے دل میں جہاد کا شوق تو ابتدا ہی سے تھا اس وجہ سے تقریباً ۱۲۲۴ھ میں آپ نے راجپوتانہ کا سفر کیا جہاں نواب امیر خان کا قیام تھا،سوانح احمدی کے مطابق آپ نے وہاں سات سال قیام کیا اس مدت میں آپ نے فوج کو وعظ ونصیحت اور جہاد کی ترغیب دی اس سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ آپ کا قیام صرف وعظ و نصیحت کے لیے تھا؛ بلکہ آپ متعدد لڑائیوں میں ایک دستہ کے امیر اور نواب کے مشیر خاص رہے لیکن جب وہاں کی فضا ساز گار نہ رہی تو پھر آپ نے دہلی کا قصد کیا نواب امیر خان کے یہاں قیام کا مقصد ہی یہ تھا کہ نواب کی مدد سے بھارت میں حقیقی جہاد کا موقع پیدا ہو سکے مگر جب نواب نے بھی انگریزوں سے صلح کر لی تو یہ امید ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی اور دہلی لوٹ کر آپ کو اس غرض کے لیے مستقل جدو جہد کرنا پڑی ۔(۳)

دہلی میں قدم رکھتے ہی کامیابی نے قدم چوم لیے خود خاندان ولی اللہی آپ کے عقیدت مندوں میں شامل ہو گیا۔حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے داماد مولانا عبدالحیؒ اور آپ کے بھتیجے مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ اور خاندان

---

(۱) سیرت سید احمد شہید

(۲) ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ،مؤلف:مسعود عالم ندوی

(۳) حوالہ سابق

کے دوسرے سرکردہ اصحابِ علم وفضل نے آپ کے دست مبارک پر بیعت کی اور ارشاد وہدایت کا سلسلہ پھیلنے لگا۔مولانا عبدالحیؒ اور مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ کی معیت میں آپ نے ملک کے مختلف علاقوں کا سفر کیا، جہاں گئے آپ کے دم سے رشد وہدایت اور ایمان کی بادِ بہاری چلی ،شرک و بدعت کی ظلمت چھٹ گئی آپ کی تاثیر و جاذبیت کا کچھ عجیب حال نظر آتا ہےشخصیت کی مقناطیسیت کے ایسے دلفریب مرقع صحابہ کے بعد بہت کم دیکھنے میں آئے۔سید صاحب اوران کے رفیقوں کے قدم جس زمین پر پڑ گئے وہ سرسبز وشاداب ہوگئے اوران کی نگاہیں جن دلوں میں اتر گئیں وہ حقائق ومعارف کا گنجینہ بن گئے ایک مثال ہوتو پیش کی جائے یہاں تو ایسے واقعات کا ایک تسلسل ہے کس کو چھوڑیں اور کس کا ذکر کریں، بہرحال اس سلسلہ کا ایک اہم واقعہ، بہار کے رئیس زادے اور ناظم بہار کے نواسے ولایت علی عظیم آبادی صادق پوری نے لکھنؤ میں شرف نیاز حاصل کیا اور نقد دل وہیں ہار بیٹھے پھر ایسے حلقہ بگوش ہوئے کہ اپنی ذات تو خیر ایک چیز ہے پورے خاندان کو آپ کے قدموں میں لا کے ڈال دیا۔(۱)

سید صاحب اوران کے رفقاء نے ۱۲۳۱ھ تا ۱۲۳۶ھ کے درمیان میرٹھ،مظفر نگر، سہارنپور اور شمالی ہند کے بعض اضلاع کا دورہ کیا لوگوں کو توحید اور اصلاح بدعات کی تلقین کی ، ہزاروں نے بیعت کی اور لاکھوں آپ کی تبلیغ سے حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے، اسی درمیان پنجاب میں سکھوں کے ظلم وستم کی رودادیں بھی سنیں جس سے سمند شوق کو ایک اور تازیانہ لگا؛لیکن پہلے حج کے سفر کو ترجیح دی سید صاحب کا سفر حج بے شمار برکتوں اور سعادتوں کا باعث ہوا۔

۱۲۳۶ھ میں عید الفطر کے دن ۴۰۰ مرد،عورتوں اور بچوں کے ساتھ رائے بریلی سے روانہ ہوئے ہر منزل پر قیام اور تبلیغ کرتا ہوا یہ قافلہ ۱۲۳۷ھ میں غمزدہ دل ودیدہ پرنم کے ساتھ وطن مالوف کی طرف چل کھڑا ہوا۔ ۲۹رشعبان ۱۲۳۹ھ، ۳۰راپریل ۱۸۲۴ءکوتقریباً تین برس کی غیر حاضری کے بعد یہ اپنی منزل پر واپس آ گیا۔

جہاد

حج سے واپسی کے بعد پھر وعظ وتبلیغ کا سلسلہ شروع ہوگیا مگر اب اصل زور جہاد وہجرت پر تھا،مولانا اسماعیل شہیدؒ اور مولانا عبدالحیؒ اور دوسرے ممتاز رفقاء مختلف علاقوں میں تبلیغ وارشاد کے لیے بھیجے گئے اور ساتھ ہی جہاد کی عملی تیاریاں بھی ہونے لگیں پنجاب میں سکھوں کی حکومت تھی مسلمانوں کی مسجدیں،عبادت گاہیں،

(۱) ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک

عورتوں کی ناموس بھی محفوظ نہیں رہی تھی، گاؤ کشی اور اذان پر پابندی تھی غرض مظالم کا ایک بے پناہ سیلاب تھا آنکھیں سب کچھ دیکھ رہی تھی لیکن اعضاء شل ہو چکے تھے تیرھویں صدی ہجری کا آغاز مسلمانانِ ہند کے لیے ابتلا اور آزمائش کی گھڑی تھی جس ملک میں مسلمان کبھی سلطان عالی اور شہنشاہ بن کر گلچھرے اڑا رہے تھے اب وہاں کا چپہ چپہ ان کے خون کا پیاسا تھا۔

خان و پٹھان کے بہت سے خاندان تھے جن کو اپنی نسلی شرافت اور شجاعت و بہادری پر ناز تھا؛ لیکن کشورِ ہند کے طول و عرض میں اگر کوئی اللہ کا نام لے کر اٹھا تو چند ملے اور ملانے تھے۔ مسند درس پر قال اللہ اور قال الرسول کا رٹ لگانے والوں نے میدان کارزار میں مسندِ جہاد بچھانے کی ٹھانی یہ اللہ کے بے برگ ونوا بندے صرف اللہ کے بھروسے سید احمد شہیدؒ کے ساتھ کھڑے ہوئے اور اس راستے میں اپنا گھر بار، رشتہ وا قارب اور وطن سب کچھ قربان کر دیا مسندِ درس پر قران وحدیث کا درس دینے والوں نے شمشیر زنی اور توپ افگنی کے خوب خوب جوہر دکھائے کامیابی و کامرانی ان کے ہم رکاب تھی ظفر مندی قدم کا بوسہ لینے آگے بڑھی پشاور نے اطاعت میں سبقت کی، قریب تھا کہ سارا پنجاب اور سرحد اسلامی نور سے جگمگانے لگتا اور ایک مرتبہ پھر دنیا کے سامنے خلافت راشدہ کا عملی نمونہ سامنے آجاتا لیکن ابھی مسلمانوں کی بدنصیبی اور برے دن ختم نہیں ہوئے تھے۔

برا ہو نسلی غرور اور قبائلی عصبیت کا جس نے سب کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ کچھ مجاہدین کی ناتجربہ کاری، کچھ علمائے سوء کی تفریق انگیز حرکات ان سب میں سب سے بڑا شر افغان سرداروں کی جاہلانہ عصبیت، ان سب چیزوں نے مل ملا کر کایا پلٹ دی، علمائے سوء نے مجاہدین پر کفر کے فتوے لگائے سرحد کے خانوں نے اپنے مرشد سے غداری کی نتیجہ یہ ہوا کہ سید احمد شہیدؒ نے بالاکوٹ میں جامِ شہادت نوش فرمایا اور مولانا اسماعیل شہیدؒ بھی اپنی دلی مراد کو پا گئے یہ حادثہ جانکاہ ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ جمعہ کا دن سرزمین بالاکوٹ میں پیش آیا۔ ہزار ہزار رحمتیں ہوں بالاکوٹ کی سرزمین پر کہ اس کی خاک میں امت کی بہترین آرزوئیں آسودۂ خواب ہیں۔

سید احمد شہیدؒ کا تجدیدی کارنامہ

۱-حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک ایک جامع تحریک تھی، بھارت کی تاریخ میں اتنی جامع تحریک شاید اب تک کوئی اور نہیں ہو سکی اگر آپ کی تحریک کی جامعیت پر نظر کی جائے تو علم وعمل کے جامع اور دین و دنیا کے جامع شب بیدار اور شہسوار اللہ کے لیے محبت کرتے تھے اور اللہ ہی کے لیے دشمنی بھی مول لیتے، نفس کے

مجاہدے کے ساتھ کفار سے جہاد بھی کرتے ،اسی طرح آپ کی شخصیت میں بھی اللہ کے فضل سے جامعیت کے پورے اوصاف موجود تھے، بقول مولانا آزاد'' وہ گویا ایک خاص پہناوا تھا جو صرف ایک جسم کے لیے تھا اور ایک ہی پر چست آیا دنیا اس کے لیے خلعت عظمت اور تشریف قبول کاندھے پر ڈالے منتظر کھڑی تھی زمانہ اپنے سارے سامانوں کے ساتھ کب سے اس کی راہ تک رہا تھا، امیدواروں پر امیدوار یکے بعد دیگرے گزرتے رہے مگر اس کا مستحق کوئی نہ نکلا''۔(۱)

۲-سید صاحب کی دعوت خالص کتاب وسنت کی دعوت تھی، بدعت وشرک کا مٹانا انکا مشن تھا۔وہ دینِ محمدی میں عہدِ فاروقی کی پاکیزگی اور شوکت پیدا کرنا چاہتے تھے،توحید خالص کی تبلیغ ،قبر پرستی کا استیصال، مراسمِ تعزیہ کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا اور نکاح بیوگان کی ترویج یہ ان کے دعوت کے اہم عناصر تھے۔اسلامی ہند میں جو کچھ اصلاح وتجدید ہوسکی وہ سید صاحب اوران کے کفش برداروں کی انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے۔(۲)

۳-سید صاحبؒ کی تحریکِ جہاد کا حقیقی نصب العین خلافتِ اسلامیہ کا قیام تھا ہندوستان کی تاریخ میں کوئی ایسی تحریک نہیں ہوئی جو صرف اللہ کے نام کی بلندی اور اس کی بات کو اونچی کرنے کے لیے تلوار اٹھائی ہو، سید صاحبؒ مکمل اسلامی نظام کے داعی تھے، بھارت کی کسی بھی حکومت کو ان بلند مقاصد سے کیا نسبت، سید صاحبؒ کا نصب العین اتنا واضح اور روشن تھا کہ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں،آپ کا مقصد خلافت راشدہ کی نمونے پر حکومت الٰہی کی تاسیس کرنا تھا۔

۴-سید صاحبؒ اوران کے رفقاء کی یہ تحریک اپنی وسعت کے اعتبار سے بھی بے نظیر تھی ،آپ کے رفقاء نے اپنی بلند ہمتی سے اسلام کا علم اٹھایا اور مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دی جس کی آواز ہمالیہ کی چوٹیوں اور نیپال کی ترائیوں سے خلیج بنگال کے کناروں تک یکساں پھیل گئی لوگ جوق در جوق اس علم کے نیچے جمع ہونے لگے اس مجددانہ کارنامے کی عام تاریخ لوگوں کو بس یہی معلوم ہے کہ ان مجاہدوں نے سرحد پار کی اور سکھوں سے مقابلہ کیا اور شہید ہو گئے، حالانکہ یہ واقعہ اس پوری تاریخ کا صرف ایک باب ہے۔سید صاحبؒ اور آپ کے رفقاء کا اصل کارنامہ یہ تھا کہ آپ نے سوئی ہوئی قوم میں،جس کے اعضاء مفلوج ہو گئے تھے جہادی اسپرٹ پیدا کردی، آئندہ سو سال تک آپ کے اصحاب خاص کر علمائے صادق پور نے اپنے لہو سے میدان کارزار گرم رکھا آپ کی شخصیت صرف ایک جامع شخصیت نہیں تھی؛ بلکہ آپ کی ذاتی تربیت سے ایک ایسی جماعت پیدا ہوگئی تھی

(۱) تذکرہ: مولانا ابوالکلام آزاد　　(۲) سیرت سید احمد شہید، ج:۱،ص:۴۰

جس نے آپ کی شہادت کے بعد ملک کے طول وعرض میں رشد و ہدایت اور تجدیدِ جہاد کی ایک لہر پیدا کر دی۔ آپ کی تربیت یافتہ ہر ایک اپنے آپ میں ایک آفتاب و ماہتاب تھے آپ صرف قائد نہیں تھے؛ بلکہ قائد گر تھے۔آپ نے ایک ایسی جماعت پیدا کر دی جو اس دورِ زوال میں صحابہ کا نمونہ تھے اللہ کے لیے جان دینے، والے شریعت پر جینے مرنے والے، شرک و بدعت سے نفور، جہاد کے نشے میں سرشار، متقی وعبادت گزار۔ صحابہ وتابعین کے بعد ایک ہی جگہ میں ایسی جماعت مشکل سے ملے گی۔

۵-بھارت کی تاریخ میں کسی ایسی مذہبی جماعت کا علم نہیں جو اس تحریکِ احیائے سنت و جہاد سے زیادہ منظم اور وسیع ہو جس کے مذہبی وسیاسی اثرات اتنے ہمہ گیر اور دور رس ہو برصغیر و ہند میں جتنی بھی سیاسی مذہبی اور سماجی تحریکیں تنظیمیں پیدا ہوئیں وہ سب بڑی حد تک اس طویل جہاد کا رہینِ منت ہے۔ اس سلسلے میں مولانا آزاد کا ایک اقتباس پڑھنے کے لائق ہے مولانا اپنی شہرۂ آفاق کتاب 'تذکرہ' میں رقم طراز ہیں۔

۶-دعوت و اصلاحِ امت کے جو بھید پرانی دہلی کے کھنڈروں اور کوٹلہ کے حجروں میں دفن کر دیے گئے تھے اب اس سلطانِ وقت اور اسکندر عزم کی بدولت شاہ جہاں آباد کے بازاروں اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ان کا ہنگامہ مچ گیا اور ہندوستان کے کناروں سے بھی گزر کر نہیں معلوم کہاں کہاں تک چرچے اور افسانے پھیل گئے، جن باتوں کے کہنے کی بڑوں بڑوں کو بند حجروں کے اندر تاب نہ تھی وہ سر بازار کی جا رہی تھیں اور خون شہادت کے چھینٹے حرف و حکایات کو نقوش وسواد بنا کر صفۂ عالم پر ثبت کر رہے تھے۔(۱)

۷-موجودہ زمانے کے مسلمانوں کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ یہ سوچتے ہیں کہ مسلمانوں کے پاس کوئی ایسا ہیرو یا با کردار شخصیت نہیں جس کی وہ پیروی کر سکیں حضور نبی کریم ﷺ کی سیرت کو بطور معجزہ زیادہ اور بطورِ اسوہ بہت کم بیان کیا جاتا ہے۔ اس لئے خاص کر مسلم نوجوانوں میں یہ شعور پیدا ہو گیا ہے کہ مسلمانوں کے پاس ایسے قائد اور لیڈر کی کمی ہے جس کی اتباع کر کے دین و دنیا دونوں کی کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے۔ ایسے تمام حضرات کو راقم دعوت دیتا ہے کہ آپ سیرت سید احمد شہید کا مطالعہ کریں حضرت سید احمد شہید کی سیرت ہر لحاظ سے جامع ہے ان کی سیرت سیف و تسبیح کی بھی جامع تھی اور محبت وشوقِ الٰہی کے ساتھ حرکت و عمل کی قوت کی بھی، ایک عارف ایک مصلح اور ایک مجدد کی حیثیت سے بھی یہ سیرت مکمل ہے یہ سیرت نوجوان اور مسلمانوں کے ہر طبقے کو یہ پیغام دیتی ہے کہ وہ خود کے بدلنے کے ساتھ ساتھ زمانے کو بدلنے کی بھی کوشش کریں۔

---

(۱) تذکرہ: مولانا ابوالکلام آزاد

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی

مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی ❖

آزاد بھارت میں برطانیہ کی غلامی سے آزادی کی تحریکات کی بڑی اہمیت ہے، موجودہ حالات کے تناظر میں اس کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے کیونکہ ہندوتو طاقتوں کی جانب سے بار بار یہ سوالات اٹھائے جاتے ہیں کہ بھارتی مسلمان سچے محب وطن نہیں ہیں، اور اسی لئے یہ ضروری ہے کہ جنگ آزادی کی تاریخ میں مسلمان عوام اور علماء اسلام کی بیش بہا قربانیوں کو یاد کیا جائے اور اپنے ہم وطنوں کو یہ بتا دیا جائے کہ انہوں نے دیش کے لئے کیسے کیسے مجاہدانہ کردار ادا کئے اور کتنی بڑی تعداد میں مذہبی رہنماؤں نے پھانسی کے پھندوں کو چوما اور جام شہادت نوش کئے، اس کا بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ مسلمان معذرت خواہی کی نفسیات میں مبتلا نہیں ہوں گے اور ان کے دل ودماغ میں غلامانہ جذبات پرورش نہ پاسکیں گے۔

آزادی ہند کی جدوجہد انگریز کے غلبہ کے ساتھ ہی شروع ہوگئی اور بالآخر ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء میں بھارت کی آزادی پر منتج ہوئی، جیسے جیسے ہمارے ملک میں انگریز کا تسلط بڑھتا گیا بھارتی اقوام بالخصوص مسلمانوں میں انگریزوں کی حکمرانی سے نفرت بڑھتی گئی، بنگال میں ۱۷۵۷ء میں انگریزوں نے سراج الدولۃ کو شکست سے دے کر پورے بنگال و بہار اور اڑیسہ پر قبضہ کرلیا اور پھر ۱۷۹۹ء میں میسور کے حکمراں ٹیپو سلطان کو فیصلہ کن جنگ میں ہرا کر اپنے قبضہ کو مستحکم کیا، اس کے بعد پورے بھارت میں انگریز کی حکمرانی مستحکم ہوگئی اور جب انگریز کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا کہ ''خلق خدا کی، ملک بادشاہ سلامت کا، اور حکم کمپنی بہادر کا'' تو شاہ عبدالعزیزؒ نے یہ فتوی صادر فرمایا کہ آج سے ملک دارالحرب ہوگیا ہے، شاہ عبدالعزیزؒ کا یہ فتوی بنیاد بنا انگریز حکومت کے خلاف جنگ کا، اور اس کے نتیجہ میں آزادی کی طویل جدوجہد کے درمیان بہت سی چھوٹی بڑی تحریکات اٹھتی رہیں، مسلمان اور غیر مسلم اقوام شانہ بہ شانہ انگریز کی غلامی سے نجات پانے کے لئے مسلح اور غیر

❖ استاذ المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

مسلح مزاحمت کرتے رہے، ان تحریکات میں سرفہرست ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی تحریک ہے، اس تحریک کی خاص بات یہ تھی کہ علماء اسلام اس تحریک میں قائدانہ رول میں تھے، اور بڑے پیمانہ پر علماء اور مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا تھا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا پس منظر یہ ہے کہ ہند میں انگریزی حکومت کے استحکام کے ساتھ ساتھ یہاں کے عوام میں حکمراں طبقہ سے نفرت وعداوت بڑھتی رہی اور اس کا اصل سبب یہ تھا کہ انگریزوں کی حکمرانی جابرانہ اور آمرانہ طرز پر چل رہی تھی، عوام پر بھاری ٹیکس عائد کردیئے گئے، عیسائی مشنریز بڑی تعداد میں پورے ملک میں پھیل گئیں اور عیسائی مذہب کا پرچار کرنے لگے، جس کی وجہ سے مذہبی طبقوں میں ناراضگی پھیل گئی، بالخصوص مسلمان اپنے مذہب کے بارے میں بڑا خطرہ محسوس کرنے لگیں، موقع بہ موقع انگریز حکومت عوام دشمن پالیسیاں نافذ کرنے لگی، جن میں ایک مشہور واقعہ یہ ہے کہ انگریزی حکومت فوج کے لئے ایسے کارتوس سپلائی کرنے لگی جن میں گائے اور خنزیر کی چربی استعمال کی گئی تھی، اور اس کے استعمال کا طریقہ یہ تھا کہ فوجی کو اپنے دانت کی مدد سے کارتوس کے خول کو ہٹانا پڑتا تھا، اس قسم کے کارتوس استعمال کرنا مسلمانوں اور غیر مسلم حضرات کو سخت ناگوار گذرا کیونکہ اس کی وجہ سے ان مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچتی تھی، الگ الگ فوجی چھاؤنیوں میں فوجیوں کو پریڈس کراوائی گئی اور انہیں ایسے کارتوس استعمال کرنے پر مجبور کیا گیا جن میں گائے اور خنزیر کی چربی ملی ہوئی تھی، اس بنا پر تیزی کے ساتھ مسلمان اور غیر مسلم فوجیوں میں باغیانہ جذبات پیدا ہونے لگے۔

فرقہ پرستی کی سیاست کرنے والوں کی طرف سے بار بار یہ دعوی کیا جاتا ہے کہ بھارت کی اقوام متحد ہوکر پرامن زندگی نہیں گذار سکتیں، کیونکہ ان کے عقائد ونظریات الگ ہیں، ان کا رہن سہن، ان کی تہذیبیں الگ الگ ہیں، لہٰذا دوقومی نظریہ ہی ان کا مقدر ہے، لیکن ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی نے یہ ثابت کردیا کہ بھارتی اقوام اور مسلمان آپس میں مل جل کر ایک بڑا انقلاب پیدا کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں، اور مساوات اور انصاف کی بنیاد پر ایک دوسرے کے دست وباز و بن کر ایک نیا انقلاب بھی پیدا کرسکتے ہیں، کسی بھی معاشرہ کا اشرافیہ جن کی پالیسی پسماندہ طبقات کا استحصال کرنا اور انہیں اپنی غلامی میں جکڑے رکھنا ہے وہ لوگوں کے دلوں میں یہ بات راسخ کردینا چاہتا ہے کہ بھارتی اقوام اور مسلمان ایک ساتھ مل جل کر پرامن زندگی نہیں گذار سکتے تاکہ ان کا استحصالی نظام قائم ودائم رہے، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے یہ اچھی طرح ثابت کردیا کہ بھارت کے مختلف طبقات کے لوگ آپس میں مل جل کر ایک بڑا انقلاب بھی پیدا کرسکتے ہیں۔

عظیم اللہ خان نے ۱۸۵۷ء کی تحریک میں روح پھونکنے کے لئے ایک انقلابی گیت لکھا، جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ بھارتی عوام بلالحاظ مذہب وملت متحد ہوکرکس طرح ۱۸۵۷ء کی تحریک چلارہے تھے:

ہم ہیں اس کے مالک ہندوستان ہمارا پاک وطن ہے قوم کا جنت سے بھی پیارا
یہ ہماری ملکیت ہندوستان ہمارا اس کی روحانیت سے روشن ہے جگ سارا
کتنا قدیم، کتنا نعیم سب دنیا سے نیارا کرتی ہے زرخیز جسے گنگ وجمن کی دھارا
اوپر برفیلا پربت پہریدار ہمارا نیچے ساحل پر بجتاساگر کانقارا
اس کی کانیں اگل رہیں سونا، ہیرا، پارا اس کی شان وشوکت کا دنیا میں جے کارا
آیافرنگی دور سے، ایسا منتر مارا لوٹا دونوں ہاتھوں سے پیارا وطن ہمارا
آج شہیدوں نےتم کو، اہل وطن للکارا توڑو غلامی کی زنجیریں، برساؤ انگارا
ہندومسلم، سکھ، ہمارا بھائی پیاراپیارا یہ ہے آزادی کا جھنڈا اسے سلام ہمارا

(پیام آزادی سن ۱۸۵۷ء)

سب سے پہلے انقلابی آواز بنگال سے اٹھی، بھارتی سپاہیوں نے انگریزوں کی مذہب مخالف پالیسی پراحتجاج کرنا شروع کیا، جسے انگریزی حکومت نے سختی کے ساتھ کچل دیا، چنانچہ احتجاجی سپاہیوں کے قائد منگل پانڈے اور اس کے ایک ساتھی کو اپریل ۱۸۵۷ء میں پھانسی دے دی گئی، اور بڑی تعداد میں سپاہیوں کو ملازمت سے برطرف کردیا گیا، یہ خبر جب شمالی ہند میں پہونچی تو فوجیوں میں باغیانہ جذبات شدت اختیار کرنے لگے، یہاں بھی فوجیوں کی پریڈ کرائی گئی اورانہیں گائے اورخنزیر کی چربی سے بنے کارتوس کو استعمال کرنے کا حکم دیا گیا، اکثر فوجیوں نے انگریز افسروں کا حکم ماننے سے انکار کردیا اپنے باغیانہ جذبات کا اظہار پرتشدد اقدامات سے کرنے لگے، حکم عدولی پر انگریز افسروں نے پچاس سے زائد فوجیوں کوقید بامشقت کی سزا دی، خطابات چھین لئے گئے، وردیاں پھاڑ دی گئیں، بیڑیوں جکڑ کر شہر میں گشت کراتے ہوئے جیل میں ڈال دیا گیا، اس کی وجہ سے تمام فوجیوں کے جذبات مشتعل ہوگئے، پرتشدد کارروائیاں کرنے لگے، جیل توڑ کر اپنے ساتھیوں کو چھڑالیا اورراتوں رات دہلی پہنچ کر مغل بادشاہ بہادرشاہ ظفر کے قلعہ میں پہنچ کرانہیں اپنا قائد مان لیا اوران کی قیادت میں انگریزی حکومت سے مسلح مزاحمت شروع ہوگئی۔

ادھر شاملی کے میدان میں انگریز سے جہاد کرنے کے لئے علماء دیوبند نے محاذ سنبھال لیا، مولانا محمد

قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، اور حافظ ضامن شہید نے اپنے پیر ومرشد حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے ہاتھ پر بیعت جہاد کیا، اور ان کی قیادت میں اپنے علاقہ میں حکومت کا نظم قائم کر کے انگریز کے خلاف صف آراء ہوگئے حاجی امداد اللہؒ کو امام مقرر کیا گیا، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتیوی کو سپہ سالار بنایا گیا، اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کو قاضی بنایا گیا، مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی اور حافظ ضامن شہید میمنہ اور میسرہ کے افسر مقرر ہوئے، جنگ کے آغاز میں مسلمانوں کو کچھ کامیابیاں ملیں لیکن جب حافظ ضامن صاحب شہید ہوگئے تو انگریز فوج غالب ہوگئی اور مسلمان یہ جنگ ہار گئے، بہت سارے لوگ شہید ہوئے، گرفتاریاں ہوئیں، بہت سارے علماء کو پھانسی دے دی گئی، اور کچھ لوگ بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔ جنرل بخت خان کے دہلی پہنچنے کے بعد دہلی میں علماء نے انگریز کے خلاف جہاد کا فتوی دیا، شروع میں انگریز حکومت کا بڑا نقصان ہوا لیکن وہ منظم ہوکر پوری قوت کے ساتھ حملہ آور ہوئے اور مسلح مزاحمت کو کچل کر رکھ دیا، ۱۸۵۷ء کی یہ جنگ محض فوجیوں کی بغاوت نہیں تھی جسے انگریزی حکومت غدر کا نام دیتی ہے بلکہ سپاہیوں کی یہ جنگ عوامی حمایت اور ان کی تائید سے ہورہی تھی، ایک غیر مسلم مورخ میوارام گپت نے لکھا ہے کہ ''ایک اندازہ کے مطابق ۱۸۵۷ء میں پانچ لاکھ مسلمانوں کو پھانسیاں دی گئیں''۔

وی ڈی ساورکر جو ہندوتو نظریہ کے بڑے قائد مانے جاتے ہیں، نے بھی کھلے دل سے یہ اعتراف کیا ہے کہ ہندو اور مسلمان اچھی طرح جانتے تھے کہ وطن عزیز کو آزاد کرانے کے لئے دونوں کا متحد ہوکر لڑنا ضروری ہے، ساورکر نے اپنی کتاب (دی انڈین وار آف انڈپینڈینس) میں لکھا ہے:..... ہندو اور مسلمان دونوں اپنے ملک کی آزادی کے لئے کاندھے سے کاندھا ملا کر لڑے، تاکہ ملک آزاد ہونے کے بعد مشترکہ طور پر ہندوستان میں ہندوستانی حکمرانوں اور شہزادوں کی حکومت قائم کی جاسکے .....۔(۱)

ساورکر کا یہ اعتراف بھی ملاحظہ کیجئے:

> ''عظیم سنت اور صوفی مزاج احمد شاہ نے بہت ہوشیاری سے لکھنؤ اور آگرہ کے ہر حصے میں جہاد کا پیغام پھیلا دیا، جگدیش پور کے ہیرو کنور سنگھ صوبے کی کمان ہاتھ میں لے چکے تھے اور نانا کے مشورے سے جنگی ساز وسامان جمع کرنے میں مصروف تھے، جہاد کی یہی جڑیں پٹنہ میں بھی پھیل رہی تھیں، جہاں پورا شہر

(۱) ڈی وی ساورکر: دی انڈین وار آف انڈپینڈینس ۱۸۵۷ء، راجدھانی دہلی ۱۹۷۰ء، ص:۶۷

انقلابی پارٹی کے زیر اثر تھا، مولوی، پنڈت، زمیندار، کسان، تاجر، وکیل، طالب علم اور تمام ذات برادریاں اور معاشرے اپنے وطن اور مذہب کے لئے اپنی جانیں قربان کرنے کو تیار تھے''۔(۱)

۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء کو جس انقلابی فوج نے بہادر شاہ ظفر کو بھارت کا آزاد بادشاہ چنا تھا، اس کے ۸۰ فیصد سے زیادہ فوجی غیر مسلم تھے، نانا صاحب، تاتیا ٹوپے اور مہارانی لکشمی بائی نے اس فیصلے میں اہم کردار ادا کیا تھا، انقلابی فوج کی کمان بخت خان، شریدھاری لال، غوث محمد اور ہیرا سنگھ کے ہاتھوں میں تھی، گویا مسلمان، ہندو اور سکھ برادری سے آنے والے کمانڈر اس مشترکہ فوج کی قیادت کررہے تھے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ناکامی سے دوچار ہوگئی؛ لیکن اس جنگ نے انگریزی حکومت کے خلاف ایک زبردست لہر پیدا کردی، انگریز کی غلامی سے آزاد ہونے کی عوام میں ایک امنگ پیدا کردی، یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد متعدد تحریکیں وجود میں آئیں، اور انگریز حکومت کے خلاف دباؤ بڑھتا گیا۔

اخیر میں یہ عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آزادیٔ ہند کی تحریکوں سے واقفیت اور آگاہی یقیناً ضروری ہے، تاکہ ہم اپنے آباء واجداد کے کارناموں سے واقف رہیں، اور اپنے ہم وطنوں کو بتاسکیں کہ ہمارے اسلاف نے دیش کی حفاظت کے لئے کس قدر قربانیاں پیش کیں، اور سب سے اہم بات یہ کہ اپنے اسلاف کے تاریخی کارناموں سے واقفیت اس لئے بھی ضروری ہے تاکہ ماضی سے سبق لے کر ہم اپنا حال درست کرسکیں، اور مستقبل کی حفاظت کے لئے بہتر منصوبے بناسکیں، اور اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چل کر ہم بھی دین کی نشرواشاعت کے ساتھ ساتھ وطن کی تعمیر وترقی میں اپنا کردار ادا کرسکیں، لیکن اگر ہمارا رول صرف اسی قدر رہے کہ بس ہم اپنے اسلاف کی خدمات کے تذکرے کرتے رہیں اور خوش ہوجائیں تو ہم ماضی میں جینے والی قوم بن کر رہ جائیں گے، ہم اپنا حال کھودیں گے اور مستقبل کے نقوش نہیں بناسکیں گے، اللہ تعالی ہم سب کو دینی بصیرت اور مومنانہ فراست عطا فرمائے۔

○○○

---

(۱) حوالۂ سابق

تحریک ریشمی رومال

مفتی محمد شاہد علی قاسمی ❖

موضوع پر راست کچھ لکھنے سے پہلے تحریک ریشمی رومال کے بانی، تحریک خلافت، تحریک ترک موالات کے قائد اور زندانِ مالٹا کے اسیر شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی رحمہ اللہ کی زندگی پر مختصر روشنی ڈالتے ہیں:

حضرت شیخ الہند 1268ھ مطابق 1851ء بہ مقام بریلی پیدا ہوئے، جہاں آپ کے والد مولانا ذوالفقار علی دیوبندی بہ وجہ ملازمت مقیم تھے۔ چھ سال کی عمر میں تعلیم شروع کی، قرآن پاک میاں جی منگلو اور میاں جی مولوی عبداللطیف سے پڑھا۔ فارسی اور عربی کی کتابیں اپنے چچا مولانا مہتاب علی سے پڑھیں۔ حضرت شیخ الہند کی عمر پندرہ سال تھی جب 15 محرم 1683ھ 30 مئی 1866 کو دیوبند کے شہر میں ایک عربی مدرسہ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ تو حضرت شیخ الہند نے بقیہ تعلیم یہیں حاصل کی، دیوبند کی مشہور مسجد، مسجد چھتہ میں ایک انار کے درخت کے سایہ میں تعلیم کا آغاز ہوا تھا۔ مروجہ علوم اسلامی کی تحصیل کے بعد استاذ محترم، بانی ادارہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ نے شیخ الہند رحمہ اللہ کو ادارہ کے استاذ کی حیثیت سے تقرر کرلیا، 1305ھ 1888ء میں مولانا سید احمد دہلوی صدر مدرس دارالعلوم دیوبند کے مستعفی ہونے کے بعد حضرت شیخ الہند کو دارالعلوم دیوبند کا منصب صدارت تفویض کردیا گیا۔ اور ایک لمبی مدت تقریبا پچاس سال تک صدر مدرس رہے۔

شیخ الہند کا جذبہ آزادی

حضرت شیخ الہند نے برطانوی استعمار سے آزادی کے لئے سب سے پہلے میدان جہاد میں اس وقت قدم رکھا جب پورے اہل ہند پر سکوت طاری تھا۔ انگریز کی مخالفت گویا موت کو دعوت دینا تھی۔ 1878ء کو

❖ معتمد تعلیم: المعهد العالی الاسلامی حیدرآباد

حضرت شیخ الہند نے ثمر التربیت کے نام سے ایک جماعت کی بنیاد رکھی اور منظم طریقہ سے نوجوانوں میں انقلابی روح پھونکنے کا عزم لے کر اٹھے۔

حضرت مدنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''شروع شروع میں قیاس سے بھی زیادہ مشکلات سامنے آئیں اور تند آندھیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بادِسموم کے جھلسا دینے والے تھپیڑوں نے طمانچے مارے، احباب واقارب مارِآستین بن گئے، ہر شخص ناصح وخیرخواہ بن کر سدراہ بنا اور کیوں نہ بنتا، انگریز نے اس قدر پیش بندی کر رکھی تھی کہ سیاست کی طرف آنکھ اٹھانا 1857ء کا سماں باندھنا تھا۔ آزادی اور انقلاب کو اگر کوئی خواب میں بھی دیکھ لیتا تو پتہ پانی ہوجاتا تھا۔ چاروں طرف خفیہ پولیس کا جال بچھا ہوا تھا، پھر کس طرح امید کی جاسکتی تھی کہ کوئی شخص ہم خیال اور ہم زبان باہم عمل ہوسکتا ہے۔ بہرحال مولانا شیخ الہند تمام خطرات سے قطع نظر اللہ کا نام لے کر اس بحر ذخار میں اور ہولناک طوفان میں کود کر آگے بڑھے اور لوگوں کو ہم خیال اور رفیق سفر بنانے لگے۔ بڑے بڑے علما ومشائخ سے چونکہ ناامید اور مایوس تھے اس لئے تلامذہ اور مخلص سمجھدار لوگوں جن میں ہندو مسلم سب شامل تھے کو ہم خیال بناتے رہے۔''

دوسری جنگ عظیم سے کچھ پہلے شیخ الہند رحمہ اللہ نے ایک پروگرام ترتیب دیا تھا کہ جرمنی، ترکی، افغانستان اور آزاد قبائل کے ذریعے فرنگی پر ایک بڑا حملہ کیا جائے گا اور ایک منظم جنگ کے ذریعے فرنگی کو ہندوستان سے نکلنے پر مجبور کیا جائے گا۔ مولانا حسین احمد مدنی اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ چونکہ بغیر جنگ کے انگریز کا نکلنا اور وطن کی آزادی ممکن نہیں ہے، اس طرح کے انقلاب کے لئے محفوظ مرکز یاغستان ہے جہاں جنگجوؤں اور اسلحہ کی ترسیل وحصول آسان ہے۔ اسی طرح قبائلی علاقوں کے لوگ بھی مسلح جہاد میں ساتھ دیں گے، اسی لئے حاجی صاحب ترنگ زئی کو قبائلی علاقے اور مولانا عبیداللہ سندھی کو کابل بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس کے لئے ''جند اللہ'' نامی ایک تنظیم کی بنیاد رکھ دی گئی تھی اور اس کے زیرِ انتظام تمام جنگی امور طے کئے گئے تھے۔ 1914ء میں مولانا فضل ربی، مولانا فضل محمود مخفی اور باچا خان کی ہندوستان میں شیخ الہند کے ساتھ اس سکیم کے حوالے سے تفصیلی بحث بھی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے بہت سے لوگوں کو شیخ الہند نے کابل کام کرنے کے لئے بھیجا تھا۔

مولانا سندھی کہتے ہیں کہ مجھے ایک روز شیخ الہند نے کہا کہ تم کابل جاؤ، مجھے باقی کچھ نہیں بتایا گیا کہ مجھے کابل جا کر کیا کرنا ہے مگر چونکہ استاد کا حکم تھا سو ماننا پڑا اور 1915ء کو میں کابل پہنچا۔ جب وہاں میں پہنچا،

میں نے ساری صورت حال کو سمجھا تو شیخ الہند کے کابل بھیجنے کی وجوہات کو سمجھا کہ یہاں کتنا کام میرے لئے پڑا ہے۔ جب مولانا سندھی نے کابل میں کچھ وقت گزارا، حالات کو سمجھا اور مزاحمت کے لئے درکار وسائل کو پورا کرنے کے لئے عملی کام شروع کیا تو شیخ الہند نے چند رفقاء کے ساتھ حجاز جانے کا فیصلہ کیا؛ تا کہ باہر سے مستقبل کے لائحہ عمل کی دیکھ بھال کی جا سکے۔ مولانا آزاد نے ہندوستان میں رہنے کا مشورہ دیا مگر شیخ الہند باھر جانے کو ترجیح دے رہے تھے۔

حجاز پہنچ کر شیخ الہند نے مدینہ میں ترکی کے وزیر انور پاشا سے ملاقات کی۔ ان کا ارادہ ترکی جانے کا تھا اور خود آزاد قبائل میں بھی آنا چاہتے تھے مگر دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے ایسا اس وقت ممکن نہ ہو سکا۔

کابل میں مولانا سندھی نے جو کمی بیشی مستقبل کی پلاننگ کے حوالے سے دیکھی، مناسب سمجھا کہ ان حالات سے شیخ الہند کو آگاہ کیا جائے۔ اس حوالے سے تمام باتوں کو رازداری میں رکھنے کے لئے ریشمی رومالوں پر کچھ باتیں تحریر کی گئیں۔ اور تین خطوط لکھوائے، یہ تینوں خطوط ایک نوعمر طالب علم عبدالحق کو دیئے گئے کہ وہ یہ خطوط سندھ میں جا کر شیخ عبدالرحیم کو پہنچائے۔ سندھ جانے کے بجائے عبدالحق نے یہ خطوط اپنے پرانے واقف کار، جن کا نام خان بہادر رب نواز تھا، کو دکھائے۔ یہ خان بہادر انگریز کا وفادار تھا۔ خان بہادر کے بقول عبدالحق ان کے بچوں کو پہلے پڑھایا کرتا تھا۔ ان کے بقول عبدالحق نے یہ خطوط ان کو 14 اگست 1916ء کو دیئے جن کو کابل سے اسی کام کے لئے بھیجا گیا تھا۔ کمشنر ملتان نے ان خطوط کو پنجاب کے سی آئی ڈی کے حوالے کیا جس نے ترجمہ کر کے اس معاملے کی حساسیت کو سمجھا۔

انگریزوں کی ڈائری کے مطابق تین ریشمی کپڑوں پر تین خطوط تحریر کئے گئے۔ پہلا خط شیخ عبدالرحیم کے نام ہے۔ یہ چھ انچ لمبا اور پانچ انچ چوڑا ہے۔ دوسرا خط شیخ الہند کے نام ہے جو دس انچ لمبا اور آٹھ انچ چوڑا ہے۔ تیسرا خط پہلے خط کا تسلسل ہے جو پندرہ انچ لمبا اور دس انچ چوڑا ہے۔ اصل خط شیخ الہند کے نام ہے؛ تا کہ وہ فی الوقت کابل آنے کی زحمت نہ کریں اور دوسری کچھ ضروری باتیں اس کے اندر تحریر تھیں۔ خط میں مولانا مخاطب ہیں جو عبدالحق نے ان کو بتایا کہ اس سے مراد مولانا محمود الحسن ہے اور جن کو اس تمام اسکیم کا جنرل چنا گیا ہے، جب کہ ان کے نیچے کئی درجن لفٹننٹ جنرلز جن میں حاجی ترنگ زئی وغیرہ بھی شامل ہیں، چن لئے گئے تھے۔

یہ خطوط عبیداللہ سندھی کے حکم پر لکھے گئے۔ جب ان خطوط کے مضامین کا پتہ چلا تو انگریز سرکار میں ایک ہلچل مچ گئی۔ شیخ الہند کی گرفتاری کا فیصلہ کیا گیا۔ چونکہ وہ ابھی تک حجاز میں تھے اور وہاں سے نکلنے کی تیاری

میں تھے کہ تقدیر تدبیر پر غالب آ گئی۔شریف مکہ نے انگریزوں سے خفیہ عہد و پیمان کے ذریعے شیخ الہند اور ان کے رفقاء کو گرفتار کیا، وہاں سے جدہ پھر مصر اور وہاں سے جزیرہ مالٹا لے گئے، جہاں آپ تین سال سات مہینے قید رہے اور آٹھ جون 1920ء کو آپ کو ممبئی پہنچا کر چھوڑ دیا گیا۔

آزادی کے لئے ان ہستیوں نے قربانیاں دی ہیں مگر آج ہمارے نصاب تعلیم اور تاریخ سے ان تاریخ ساز لوگوں کو جان بوجھ کر گمنام کیا گیا ہے۔ریشمی رومال کے منصوبے کے حوالے سے اس وقت کے انگریز کی طرف سے گورنر پنجاب سر مائیکل فرانسس اوڈوائر، جو کہ 1912 سے 1919 تک برطانوی حکومت کی طرف سے پنجاب کے گورنر رہے، انہوں نے برطانوی سول سروس کے تحت 1885 سے 1920 تک آئی سی ایس افسر کے طور پر مختلف علاقوں میں خدمات سرانجام دیں، نے لکھا ہے۔ان کی گورنری کا دور اس لحاظ سے بہت زیادہ اہم ہے کہ امرتسر کے جلیانوالا باغ کا سانحہ بھی ان کے دور میں پیش آیا اور گوجرانوالہ میں عوامی بغاوت کو کچلنے کے لئے فضائیہ سے بمباری کی گئی۔

تحریک ریشمی رومال کا تعلق بھی اسی دور سے ہے اور انہوں نے تحریک ریشمی رومال کا تفصیل کے ساتھ تذکرہ کرتے ہوئے ریشمی خطوط کا راز منکشف ہونے کے بارے میں اپنے مشاہدات و تاثرات بلکہ کارکردگی کا بھی ذکر کیا ہے۔سر مائیکل اوڈوائر لکھتے ہیں کہ ریشمی رومال منصوبے کی اطلاع ہمیں اگست 1916 میں ملی اور ہم اس قابل ہو گئے کہ آغاز ہی میں اسے کچل ڈالیں (لیکن یہ ان کا گمان ہے مگر درحقیقت یہ تحریک کئی عشروں سے جاری تھی)۔

اس منصوبے کی بنیاد 16-1915 میں کابل میں رکھی گئی تھی۔طے پایا کہ ایک طرف ترک اور عرب شریف مکہ کی سربراہی میں متحد ہو جائیں اور دوسری طرف افغان، سرحدی قبائل اور ہندوستانی مسلمان ایک ہو جائیں، اس طرح اسلام کی تمام طاقتیں برطانوی حکومت کے خلاف ایک نکتے پر آ جائیں گی۔اس لائحہ عمل کو عملی شکل دینا آسان تھا۔وہ اس طرح کہ سرحدی قبائل ہندوستانی جنونیوں کے اکسانے پر حملہ کر دیتے، ادھر انہیں ہندوستان میں باغی مسلمانوں کی عمومی حمایت مل جاتی۔یہ بھی امید کی جا رہی تھی کہ انقلاب پسند ہندو اور سکھ بھی باہم مل کر فوراً ان کے ساتھ ہو جائیں گے۔سازش بڑی مہارت سے تیار کی گئی تھی۔ہندوستان کے علاوہ وسطی ایشیاء، حجاز وغیرہ میں اس سازش کی جڑیں مضبوط کی جانے لگیں۔مختلف ممالک میں ایلچی اور سفیر روانہ کئے گئے، ان کے پاس سے کوڈ ورڈز میں لکھے گئے خطوط اور پیغامات برآمد ہوئے۔اس مرحلے پر سارے پراسرار معاملے کی کلید،

یعنی سلک لیٹرز (ریشمی خطوط) حیران کن طریقے سے میرے ہاتھ لگ گئے۔ جونو جوان بھاگ کر کابل گئے، ان میں سے وہ ایک عمدہ مسلمان فوجی کے بیٹے تھے۔ وہ خان میرا پرانا دوست تھا۔ اس کے اصرار پر میں نے امیر (کابل) کو پیغام بھیجوائے کہ ان نو جوانوں کو واپس آنے کی اجازت دے دی جائے۔ ان سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی اور انہیں معاف کر دیا جائے گا۔ یہ طریقہ ناکام رہا۔ ان دونوں کا ایک خاندانی ملازم بھی ان کے ہمراہ کابل میں تھا۔ انہوں نے اسے اپنے باپ کے لئے ایک پیغام دے کر ہندوستان بھجوایا۔ اس ملازم کی آمد ورفت دیکھ کر بوڑھے باپ کو کچھ شک گزرا۔ جب اس کے ساتھ سختی کی گئی تو ملازم مان گیا کہ کابل سے وہ کچھ اور بھی لایا تھا۔ یہ وہی مشہور ومعروف سلک لیٹرز تھے۔ وہ فارسی میں زرد ریشمی کپڑے پر لمبائی کے رخ لکھے گئے تھے۔ لکھنے والے کا خط اچھا تھا اور اس کپڑے کو کوٹ کی لائننگ کے اندرونی جانب سی دیا گیا تھا۔ وہ کوٹ حفاظتی نقطہ نظر سے ایک مقامی ریاست میں رکھا گیا تھا۔ خان کی دھمکیاں کارگر ثابت ہوئیں اور وہ کوٹ پیش کر دیا گیا۔ خان نے دو سلک لیٹرز کاٹ لئے، کیونکہ وہ زیادہ فارسی نہیں جانتا تھا لہٰذا ان کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ تاہم اسے یقین تھا کہ سلک لیٹرز کچھ نہ کچھ خفیہ معانی ضرور رکھتے تھے۔ کمشنر نے وہ مجھے بھجوا دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہلا بھیجا کہ اس کے خیال میں وہ الفاظ بالکل بے معنی اور ناقابل فہم تھے۔ میں ابتدا میں ان کا مفہوم نہ سمجھ سکا، لیکن اتنا جان گیا کہ وہ کسی وسیع منصوبے کے بارے میں تھے۔ میں نے وہ سی آئی ڈی والوں کو بھجوا دیئے، جہاں سر چارلس کلیولینڈ نے بہت جلد یہ معمہ حل کر لیا۔ وہ عبداللہ انصاری (مولانا عبید اللہ سندھی اور مولانا منصور انصاری) نام کے مولویوں کی طرف سے لکھے گئے تھے، جن کا تعلق دیوبند (یوپی) مکتب فکر سے تھا۔

انہوں نے وہاں اور دہلی میں بیٹھ کر تبلیغ جہاد کے لئے لکھے تھے۔ 1915 میں کابل جاتے ہوئے انہوں نے ہندوستانی جنونیوں سے بھی ملاقات کی تھی۔ وہاں ان کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ ترکی اور جرمنی کے مشن سے ان کا رابطہ ہوا۔ علاوہ ازیں ہندوستانی انقلاب پسندوں، یعنی مہندر اپرتاپ اور برکت اللہ بھوپالی سے بھی ان کی ملاقات کرائی گئی۔ اس طرح انہوں نے اپنے رابطوں کو فعال بنا لیا۔ انصاری پہلے ہی عرب جا چکا تھا اور واپس کابل بھی پہنچ گیا تھا۔ سلک لیٹرز پر 9 جولائی 1916 کی تاریخ درج تھی۔ سندھ میں ایک قابل بھروسہ ایجنٹ مکتوب الیہ تھا۔ اسے تاکید کی گئی تھی کہ یا تو وہ خود لے جائے یا کسی قابل اعتماد پیغام رساں کے ہاتھ محمود حسن (شیخ الہند) نام کے ایک مسلمان مذہبی رہنما کے پاس پہنچا دے جو پہلے ہی سازش کے فروغ کے لئے دیوبند سے مکہ جا چکا تھا۔

کابل اور ہندوستان میں تحریک میں ہونے والی پیش رفت، جرمن اور ترک مشنوں کی روانگی، ہنگامی حکومت کی تشکیل اور طلبہ کی سرگرمیوں کے بارے میں تفصیلات ان لیٹرز کے اندر موجود تھیں۔ ایک خدائی لشکر (جنود ربانیہ) کی تشکیل کے خدوخال بھی اس میں درج تھے۔ بتایا گیا تھا کہ تمام اسلامی حکمران متحد ہوکر برطانویوں کو نکال باہر کریں گے۔

ان تفصیلات سے یہ بات واضح ہوئی کہ بہ ظاہر تحریک ریشمی رومال ناکامی پر منتج ہوئی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ آزادی کا مشن سرد نہیں ہوا، شیخ الہند رحمہ اللہ نے جذبہ آزادی کا جو صور لوگوں کے دلوں میں پھونکا تھا اس نے مشن کو ٹھنڈا ہونے نہیں دیا، چنانچہ اس کے بعد نام بدل کر دوسری تحریکات آزادی ناموں کے فرق کے ساتھ اٹھیں، اور مقابلہ چلتا رہا، اسی پس منظر 1919ء میں جمعیۃ کی بنیاد رکھی گئی۔ اسی طرح ایک اور تحریک، تحریک خلافت کے نام سے اٹھی، ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر ریشمی رومال کی تحریک کامیابی سے ہمکنار ہوتی تو ملک کا نقشہ کچھ اور ہوتا تھا۔

بلاشبہ شیخ الہند متبحر عالم دین ہونے کے ساتھ سیاسی میدان کا گہرا شعور رکھتے تھے، انتہائی سادگی سے زندگی گذارنے والے عالم دین ملک کی قیادت وسیادت کی اہلیت رکھتے تھے، اس لئے آپ بجا طور پر شیخ الہند کہلائے جانے کے مستحق تھے۔

○○○

تحریکِ خلافت

۱۹۱۹ء-۱۹۲۴ء

مولانا محمد ناظر انور قاسمی ❖

صلاح الدین ایوبی سے سلطان بایزید یلدرم تک صلیبی جنگوں میں پے در پے شکست کھانے کے بعد سے ہی عثمانیہ سلطنت یورپ کے لئے ایک ناسور بن چکی تھی اور اس ناقبل تسخیر سلطنت جو یوروپ، ایشیا، افریقہ اور بحر ابیض کے خطوں پر مشتمل تھی، کا شیرازہ بکھیرنے اور مسلمانوں کی مرکزیت کو توڑنے کے لئے مختلف تدابیر اپنائے جاتے رہے اور بالآخر سترہویں صدی کے آواخر سے سلطنت کا زوال شروع ہوا۔ یورپی اتحادیوں نے کبھی قوم پرستی کے نام پر، کبھی ضمیر فروش جماعت کو اپنا ہمنوا بنا کر اور کبھی سادہ لوح انسانوں کو دام فریب میں پھنسا کر داخلی بغاوت پر امادہ کیا۔ دوسری طرف بیرونی طاقتوں کی شیرازہ بندی کر کے نہ ختم ہونے والی جنگ و جدل کا میدان سجا تا رہا تا کہ بیسویں صدی کے آتے آتے یہ چھ سو سالہ عظیم سلطنت اپنی بقاء کی بھیک مانگنے پر مجبور ہو جائے۔

اٹھارہویں صدی کے آواخر میں جنوبی اور مشرقی افریقہ کی اکثر ریاستوں پر برطانوی اور فرانسیسی قوتوں کا غلبہ ہو گیا صرف لیبیا کی ریاست باقی رہ گئی، دوسری طرف مشرقی یورپ سے یونان، ہنگری، بلغاریہ اور آسٹریا سے بھی خلافت کی پسپائی ہوئی اور تھیرس، سربیا وغیرہ کا حصہ ہی دست کنٹرول میں رہا۔ 26/ستمبر 1911 میں اٹلی نے سمندری راستے سے طرابلس (موجودہ لیبیا) پر حملہ کر دیا، اور جب مشرق وسطی سے عثمانی فوج امداد کی لئے جانے لگی تو مصر میں جو پہلے ہی برطانیہ کے زیر اقتدار آ چکا تھا راستہ روک دیا گیا اور بالآخر 1912ء میں ایک معاہدہ کے تحت سلطنت نے اس خطہ سے دست برداری کا اعلان کر دیا اور اس طرح افریقہ سے سلطنت

❖ استاذ شعبہ انگریزی: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

عثمانیہ کا چراغ گل ہوگیا۔(۱) اس جنگ میں عثمانی افواج کے علاوہ مقامی لوگ بھی شانہ بہ شانہ دفاع اور مزاحمت میں کھڑے تھے اور فاطمہ بنت عبداللہ نامی ایک 13-14 سالہ بچی نے جس بہادری کا مظاہرہ کیا اور لڑتے لڑتے جام شہادت نوش کی وہ پوری دنیائے اسلام کے لئے ایک مثال بن گئی تھی اور جسے خراج تحسین پیش کرنے کے لئے مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال میں ایک خصوصی مضمون لکھا اور علامہ اقبال نے بانگ درا میں ایک نظم اس معصوم شہید کے لئے لکھی:

فاطمہ! تو آبروئے امتِ مرحوم ہے ذرّہ ذرّہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت، حورِ صحرائی! تری قسمت میں تھی غازیانِ دیں کی سقّائی تری قسمت میں تھی
یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپَر ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر

ایک طرف سلطنت عثمانیہ افریقہ میں سر پیکار تھی کہ یورپ کے مابقیہ حصہ میں بھی اکتوبر 1912ء میں ایک عظیم جنگ چھڑ گئی جسے جنگ بلقان کے نام سے جانا جاتا ہے۔ دراصل یورپ کی طرح روس کو بھی عثمانی سلطنت کھٹک رہی تھی؛ اسلئے روس کی پشت پناہی میں ایک طرف تو بلقان لیگ تشکیل دی گئی جس میں بلگاریہ، یونان، سربیا، مانیٹی اور نکروتحادی کی حیثیت سے شامل ہوئے اور دوسری طرف اندور خانہ قومیت کے نام پر بغاوت کی چنگاری سلگادی گئی۔ جنگ شروع ہونے پر سب کا گمان یہ تھا کہ ترکی کو کامیابی ملے گی اسی لئے انگلستان کے وزیر اعظم مسٹر اسکوئتھ اور فرانس کے وزیر اعظم موسیو گلے مینو دونوں نے متفقہ بیان جاری کیا کہ کوئی بھی کامیاب ہو جغرافیائی حدود برا قرارر کھے جائیں گے۔ مگر جب نتیجہ برعکس آیا تو دونوں وزیر اعظموں نے اپنا رخ بدل دیا اور دیدہ دلیری سے یہ اعلان کیا کہ کوئی وجہ نہیں کہ فاتحین کو فتح کا ثمرہ نہ ملے۔ اور بالآخر 13/مئی 1913ء کولانڈ کے مقام پر معاہدہ ہوا جس سے ترکی کے یہ صوبے آزاد ہو گئے۔(۲)

ادھر ہند کے مسلمان ترکی کو لے کر بہت ہی فکر مند تھے۔ اپنے طور پر چندہ جمع کرتے اور ہر ممکن امداد فراہم کررہے تھے۔ جنگ بلقان کے بعد بے چینی اور بڑھ گئی تھی اور یہی وہ وقت تھا جب شیخ الہندؒ چند طلبہ کے ساتھ تعلیم کو وقتی طور پر ترک کر کے نکل گئے تھے، اس وقت لاکھوں کی امداد ترکی کو دی گئی جس کا حساب اخبار 'پیسہ' لاہور میں چھپتا تھا۔ اور بالآخر 1913ء میں اس شکست کے بعد سلطنت سمٹ کر مشرق وسطی، جزیرۃ العرب اور یورپ کے ایک معمولی حصہ تک ہی محدود ہو گئی۔

---

(۱)https://www.bbc.com/urdu/world-58715133 (۲)تحریک خلافت:۵۲

پہلی عالمی جنگ

مختصراًاس کا پس منظر یوں ہے کہ 28/ جولائی 1914ء میں آسٹریا نے اپنے ولی عہد کے قتل کے الزام پر سربیا پر حملہ کردیا، روس سربیا کا حامی تھا تو اس نے آسٹریا کے خلاف فوجی کاروائی کرشروع کردی، جرمن نے روس کو دخل اندازی سے روکا اور نہ ماننے پر 30/ جولائی 1914ء کو جنگ میں کود پڑا، فرانس چونکہ روس کا حلیف تھا اس لئے 3/ اگست کو فرانس کے خلاف جرمنی نے جنگ کا اعلان کردیا۔ 4/ اگست کو برطانیہ اور 23/ اگست کو جاپان نے بھی جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کردیا؛ جبکہ نومبر 1914ء میں ترکی جرمنی کا اتحادی بن کر جنگ کا حصہ بن گیا اور اس طرح رفتہ رفتہ یہ مقامی جنگ عالمی جنگ میں تبدیل ہوگئی۔ ایک طرف برطانیہ، فرانس، روس، اٹلی، جاپان، امریکہ، یونان اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر مشتمل کل 17 ممالک کا ایک محاذ بنا اور دوسرے طرف جرمنی، آسٹریا، ہنگری، ترکی سلطنت اور بلغاریہ کا اتحاد ہوا۔

شروع شروع میں تو جرمنی اور اس کے اتحادیوں کی بالادستی نظر آئی، ادھر ترکی کو اپنے اتحادیوں کے ساتھ چار مقامات پر لڑنا پڑا، ایک کوہ قاف کے علاقے میں، دوسرے 2/ فروری 1914ء کو مصر میں، تیسرے فلسطین جہاں 19/ فروری سے 25/ اپریل 1914ء تک بری اور بحری حملے ہوئے مگر برطانوی اتحادیوں کو کامیابی نہ مل سکی، پھر عراق میں ہندوستانی فوجیوں اور باغی عربوں کی طاقت سے بریطانیہ نے ترکی کو نقصان پہونچایا حتی کہ 28/ستمبر 1916ء میں تکریت پر برطانیہ کا قبضہ ہوگیا اور بالآخر پے در پے حملوں کے بعد 9/ ستمبر 1917ء کو بیت المقدس سے پسپا ہوئے اور اکتوبر 1917 میں پورا فلسطین بریطانیہ کے قبضے میں آ گیا۔(۱)

اس دوران ہونے والی سازشیں

اس پورے عرصے میں انگریز نے کئی میدان کو محض سازش اور دروغ گوئی سے فتح کیا۔ انگریز نے ایک چال یہ چلی کہ اس زمانہ میں رعایائے فلسطین کی طرف سے بطور ترجمان ایک وفد زیر سرکردگی شیخ سلیمان تاجی فاروقی شریف مکہ کی خدمت میں بھیجا اور ان کے سامنے ترکوں پر عدم اعتماد اظہار کیا اور شریف مکہ کو یقین دلایا گیا کہ ہم اب عجم کی سرپرستی سے نکل کر عرب کی قیادت میں آنا چاہتے ہیں اور یقین دلاتے ہیں کہ ہماری پوری قوم آپ کے ساتھ ہے۔(۲) دوسری طرف شریف مکہ حسن بن علی اور مصر میں بریطانیہ کے افسر اعلی کے

(۱) تحریک خلافت ص: ۵۴

(۲) حوالہ سابق ص: ۱۰۶

درمیان ایک معاہدہ ہوا جس میں عرب کو خلافت عثمانیہ کے خلاف کے بغاوت کے لئے امادہ کرایا گیا اور یہ لالچ دی گئی کہ ہم عرب کو آزاد مملکت بنانے میں تعاون کریں گے نیز اردن اور عراق کو آپ کے دولڑکوں کے سپرد کر دیا جائے گا۔ یہ تھا وہ کھیل جو انگریز اندرونِ خانہ کھیل رہا تھا۔(۱)

پھر 16/مئی 1916ء کو حکومت برطانیہ اور فرانس کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ ''سائیکوس-پیکوٹ'' طے پایا۔ جس میں دونوں ممالک نے جنگ عظیم اول کے بعد اور سلطنت عثمانیہ کے ممکنہ خاتمے کے پیش نظر مشرق وسطیٰ میں اپنے حلقۂ اثر کا تعین کیا۔ اس میں اردن، عراق اور حیفہ کے گرد مختصر علاقہ برطانیہ کو دیا گیا۔ فرانس کو جنوب مشرقی ترکی، شمالی عراق، شام اور لبنان کے علاقے دیے گئے۔ دونوں قوتوں کو اپنے علاقوں میں ریاستی سرحدوں کے تعین کی کھلی چھوٹ دی گئی، بعد ازاں اس معاہدے میں اٹلی اور روس کو بھی شامل کرلیا گیا۔ روس کو آرمینیا اور کردستان کے علاقے دیئے گئے۔

ہندوستان اور سیاسی نقطۂ نظر

ادھر ہندوستان میں کانگریس اس وقت تک ایک معتدل جماعت تھی جس کا نصب العین ہندوستان اور بریطانیہ کے درمیان دوستی قائم کرکے آہستہ آہستہ حکومت برطانیہ میں حصہ داری حاصل کرنے تھی اور گانگریس اس جنگ میں بریطانیہ کے ساتھ تھی؛ یہ اسلئے تھا انگریزوں نے ہندوستانیوں سے وعدہ کررکھا تھا کہ جنگ کے بعد ہم حکومت میں اصلاح کریں گے اور آپ کی حصہ داری بھی ہوگی، دوسری طرف مسلمانوں سے یہ کہا گیا کہ یہ محض ایک سیاسی جنگ ہے اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے؛ بلکہ یہ بھی یقین دلایا گیا کہ ہم آپ کے مقامات مقدسہ اور خلافت جن سے آپ کا مذہبی اور جذباتی لگاؤ ہے، ان کی حفاظت کریں گے۔ جس کے بعد ہندوستان سے بڑا تعاون حاصل ہوا، اور تقریبا 5 لاکھ جنگجو اور 2/ ارب روپئے یہاں سے ملے۔ جس کا اندازہ اس رپورٹ سے ہوتا ہے جو ہزاکسلنسی کمانڈرانچیف نے وائسرائے کی مجلس قانون ساز میں ایک بیان میں پیش کیا تھا۔(۲)

مسئلہ خلافت اور مسلمانوں میں اضطراب

مگر جوں جوں فتح بریطانیہ کے قریب آتی گئی وہ ان تمام وعدوں کی خلاف ورزی کرنے لگے جس سے پوری دنیا کے مسلمانوں میں بے چینی اور خلجان پیدا ہونے لگا۔ دنیا کے مسلمانوں کو سلطنت کے خاتمے کے افسوس

(۱) Aftereffect of WW1

(۲) تحریک خلافت: ۵۴

سے کہیں زیادہ مسلمانوں کی مرکزیت کے خاتمے کا افسوس ہونے لگا۔انگریز جو عرب وعجم کے دیگر ممالک پر قابض تھے انہوں نے ملکی غلامی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو ذہنی بیماری میں مبتلا کرنے کا کام ترکی کا شیرازہ بکھیر کر کیا جس سے تمام کے دلوں میں یہ خوف پیدا ہوا کہ خلافت مدینہ سے آج تک دنیا بھر کے مسلمانوں کی ایک مرکزی خلافت رہی ہے جس کے زیر سایہ گذشتہ تقریباً بارہ سو سالوں سے کئی شرعی احکامات اور دینی عبادتیں انجام دی جارہی تھیں، آج دم توڑتی نظر آرہی تھی۔خلافت راشدہ، اموی خلافت، اور پھر عباسی خلافت کے بعد گذشتہ تقریباً چھ سو سالوں سے مسلمانوں کی مذہبی نمائندگی کرنے والی یہ عثمانی خلافت تھی جس سے مسلمانوں کا نہ صرف مذہبی بلکہ جذباتی تعلق بھی تھا اور آج یہ انگریز کے رحم وکرم پر اپنی وجود کی بھیک مانگ رہی تھی۔دوسری طرف مقامات مقدسہ کے حوالے سے بھی اضطراب بڑھ رہا تھا کہ کہیں ان پر بھی انگریزوں کا تسلط نہ ہوجائے؟ یہ وہ حالات تھے جنہوں نے دنیا بھر کے مسلمانوں کو بے چین کر رکھا تھا اور برصغیر کے مسلمان بھی اس دردو کڑھن میں ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگے تھے اور اپنی بساط وقدرت کے بقدر اس کی بقا کے لئے جد جہد شروع کردی، انہیں کوششوں میں سے ایک تحریک خلافت تھی۔

جنگ آزادی میں برادرانِ وطن کے ساتھ اتحاد کا پس منظر اور اسباب

1-رولٹ بل فروری 1919ء:

ادھر مسلمانان ہند میں اضطراب کی کیفیت طاری تھی، جو صدیوں سے حکمراں رہے تھے اب ایک مغلوب ومحکوم قوم بن گئی تھی، ہزار سالوں سے جو تین براعظموں پر حکومت کرتے آرہے تھے آج ان کا چراغ ٹمٹما رہا تھا اور مقامات مقدسہ کی بھی حفاظت کرنے کے لائق نہیں رہ گئے تھے۔ان حالات میں ہر کوئی اپنی بساط کے مطابق خلافت کی بقاء اور مقامات مقدسہ کی حفاظت کی خاطر ہر ممکن کوشش میں لگا تھا۔

دوسری طرف ہندوستانیوں سے دوران جنگ جو مراعات واصلاحات کے وعدے کئے گئے تھے وہ بھی نظر انداز کئے جانے لگے۔اس جنگ میں 5 / لاکھ سپاہیوں اور تقریباً 2 / ارب روپئے کی مدد کا صلہ دینے کے بجائے انگریز نے فتح کے غرور اور طاقت کے نشہ میں رولٹ بل پاس کرنے کا فیصلہ کرلیا جس کا مقصد ہندوستانیوں پر سول حقوق کا دائرہ اور محدود کرنا تھا جس کے چند ظالمانہ دفعات یہ تھے:

1- حکام کو اختیار ہوگا کہ جس سے چاہیں ضمانت طلب کریں۔

2- جس شخص کو چاہیں حکم دے کر کسی ایک جگہ نظر بند کردیں۔

3-امتناعی احکام بعض معمولی معاملات میں بھی جاری کرنے کے حکام مجاز ہونگے، مثلا اخبار نویسی، جلسہ یا جلوس میں شریک ہونے پر پابندی عائد کرنا وغیرہ۔

4-حکام جس کو چاہیں بلا وارنٹ اور بلا فرد جرم بتائے گرفتار کرلیں۔

5-حکام جس کو چاہیں عدالت کی سزا کے بغیر قید میں رکھیں وغیرہ۔(۱)

2-ستیہ گرہ اور جلیانوالہ باغ کا قتل عام:

جنگ عظیم اول کے بعد مہنگائی کی مار سے ہی پورا ملک دو چار اور پریشان تھا اور دوسری طرف اس بل نے پورے ملک میں غم و غصے کی چنگاری کو شعلہ جوالہ بنا دیا، اور پورے ملک میں اس کے خلاف کھلے عام احتجاجات اور مظاہرات ہونے لگے۔ادھر گاندھی جی کی طرف سے 6/اپریل 1919ء کا دن ستیہ گرہ کے لئے مقرر کیا گیا، پروگرام یہ تھا کہ لوگ دن بھر بھوکے رہیں اور شام کو کسی مقام پر جمع ہو کر اللہ تعالی سے دعا کریں۔ لوگ ننگے سر اور پاؤں مجمع میں جائیں اور تمام کاروبار بند رکھیں۔ چنانچہ پورے بھارت کے صوبوں اور اضلاع کی طرح امرتسر اور پنجاب میں بھی 6/اپریل کو پر جوش انداز میں یہ ہڑتالیں اور مظاہرے کئے گئے۔ دوسری طرف انگریز اپنی فتح اور گھمنڈ کے نشے میں چور تھا، چنانچہ ان مظاہروں کو کچلنے کے لئے سختی کی اور فوجی قوت کا بھر پور استعمال کیا۔ کئی لوگوں کی گرفتاریاں ہونے لگی اور 10/اپریل کو اس خبر سے مشتعل ہو کر کہ گاندھی جی گرفتار کر لئے گئے ہیں امرتسر میں ایک بڑی بھیڑ نے بینک پر حملہ کر دیا جس کے نتیجے میں انگریز افسروں اور ایک خاتون کا قتل ہو گیا اور یہ ایک پر تشدد احتجاج میں تبدیل ہو گیا۔ اس کے بعد جنرل ڈائر نامی ایک افسر دو ہزار فوجی دستہ کے ساتھ امرتسر پہونچتا ہے اور 13/اپریل کی صبح کسی قسم کا جلوس نکالنے اور چار آدمیوں سے زیادہ جمع ہونے پر پابندی اعلان کرواتا ہے، لیکن پبلک جو زخم پر زخم کھانے کے بعد جذبات میں ڈوبی ہوئی تھی نے اس اعلان کو نظر انداز کر کے اسی شام ساڑھے چار بجے جلیانوالہ باغ میں جلسہ عام کا اعلان کر دیا۔ ادھر ظالم جنرل کو اطلاع ہوئی تو اس نے جلسہ گاہ جانے والے تمام راستوں پر فوجی تعینات کر دیا اور واپسی کے راستے مسدود کر دیئے گئے اور پھر بھیڑ پر گولی چلانے کا حکم صادر کر دیا، اور اس وقت تک بندوقیں اور مشین گنیں چلتی رہیں جب تک کہ ان میں ایک بھی گولی باقی تھی، 379/لوگ موقع پر ہی شہید بارہ سو زخمی ہو کر ڈھیر ہو گئے۔ظلم واستبداد تو اس وقت اپنی انتہا کو پہونچی جب اس سنگ دل افسر نے زخمیوں کو اٹھانے اور ان تک پانی پہونچانے پر بھی پابندی عائد کر دی

(۱) حوالہ سابق،ص:۸۵

اورزخمی رات بھر وہیں تڑپتے اور کراہتے رہے۔اس کے بعد ڈیڑھ ماہ کے لئے مارشل لاء نافذ کردیا جس کے تحت وہاں کےلوگوں کا جینا دوبھر ہوگیااور معمولی باتوں پر غیرانسانی سزاؤں کا سامنا کرنا پڑا۔

یہ وہ واقعات تھےجس نے بلاتفریق دین ومذہب تمام ہندوستانیوں کو بےچین کرر کھا تھا،ہر طرف سےحکومت کے خلاف احتجاجات ہورہے تھے،خطابات حاصل کرنے والےشخصیات اس دلسوز واقعہ کے بعد اپنے اپنے خطابات لوٹانے لگے،مزدور ہڑتال کرنے لگے،عام شہری کے دلوں میں حکومت کے خلاف نفرت بڑھنے لگی،اور پورا ملک اس ظالم حکمراں کےخلاف ایک میدان میں جمع ہوگیااور ہندومسلم اتحاد کا دل افروز نظارہ روز بروز ہونے لگا جس کے نتیجے میں ہندوستان صدائے اتحاد وانگریز دشمنی سے کوہ آتش فشاں بن گیا،مسلمان سروں پرکفن باندھ کرمیدان میں نکل آئے اور علماءسیاسی مجلسوں میں اپنی بھر پورنمائندگی پیش کرنے لگے۔جگہ جگہ انگریزوں کے خلاف علماء کے جلسے منعقد ہونے لگے،ہندوستان کے کم وبیش تمام شہراس سیاسی گھمسان کی چپیٹ میں آگئے کہیں زیادہ توکہیں کم۔

انیسویں صدی اور مسلمانوں کی جدوجہد

ویسےتو انیسویں صدی کے آغاز سےہی ہند میں مسلم قیادت اور بالخصوص عمائدین ملت ملک ہندوستان اور بالخصوص خلافت کوبچانے کے لئے ہرطرح کی کوشش میں لگے تھے،مختلف پروگرام اور کانفرس اورمظاہرے کئے جارہے تھے۔دینی حلقوں سے دوشخصیات قائدانہ کردارادا کرنے میں سرگرم عمل تھیں،ایک شیخ الہند حضرت مولانا محمودالحسن دیوبندیؒ،جوخاموش مگر عالمی پیمانے پر"جماعت المخلصین"کے نام سےایک تحریک شروع کرچکے تھے جو بعد میں تحریک ریشمی رومال کے نام سےمشہور ہوا،جسکا مقصد اندرون ملک ایک متحدہ محاذ اورفوجی قوت بنانا اور بیرون ملک سے روابط استوار کرکے ان کوفوجی تعاون فراہم کرنے پرآمادہ کرنا تھا،تاکہ ایک ساتھ اندور اور بیرون فوجی قوت کا استعمال کرکے اس جابرحکومت کی بیخ کنی کی جاسکے،مگر افسوس کہ اپنوں کی دھوکہ بازی اور شریف مکہ کی منافقانہ حرکت سے یہ راز فاش ہوگیااور منزل سےایک قدم پہلے ہی رک جانا پڑا۔

دوسرے مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی شخصیت تھی جواپنی ذات میں ایک انجمن تھی اوروقت کےمقبول ترین شخصیات میں سے ایک تھے۔مسلم قیادت میں صف اول کی حیثیت رکھتے تھےاورحلقہ ارادت وارشادبھی بڑا وسیع تھا،آپ افرادشاس ہونے کے ساتھ ساتھ افرادساز بھی تھے،مولانا محمد علی جوہراور مولانا شوکت جیسے گوہرنایاب،جودراصل علی گڑھ اورپھر یورپ کی یونیورسیٹی کےتعلیم یافتہ تھے،کی شناخت کی،ان کو چمکایا،مولانا

کے خطاب اور اعجاز سے بھی سرفراز فرمایااوران کی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کیا گیا کہ دیکھتے ہی دیکھتے ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیا دنیائے یورپ میں بھی ان کی طوطی بولنے لگی۔

تحریک خلافت کا قیام

1914ء سے 1918ء کے درمیانی چار سالوں میں برصغیر کے مسلمان خلافت عثمانیہ کی بقا کے لئے بہت پریشان تھے۔ترکی کی خلافت کو بچانے کے لئے ہر طرح کی ممکنہ جدوجہد شروع ہونے لگی تھے،کانفرنس، پروگرام،احتجاجات اور میورنڈم کے ذریعہ بریطانیہ کواس بات کے لئے قائل کیا جارہا تھا کہ صلح کانفرنس میں،جس کا آغاز جنوری1919ءم ہو چکا تھا،اسی کو جرمنی اورعثمانی خلافت کے مقدر کا فیصلہ کرنا تھا،کوئی ایسی تجویز پاس نہ ہوجس سے خلافت کا خاتمہ ہوجائے اور مقامات مقدسہ انگریزوں کی تحویل میں چلا جائے۔بالآخر 1919ء کے اختتام میں خلافت کے مسئلے پر رائے عامہ کومنظم کرنے اورمتفقہ لائحہ عمل تیار کرنے کے لئے بمبئی میں آل انڈیا خلافت کمیٹی قائم کی گئی،اس کے صدر سیٹھ چھوٹانی اور سیکرٹری صدیق کھشتری منتخب ہوئے۔

اس موضوع پر سب قدیم اور مرجع کی حیثیت رکھنے والی کتاب ''تحریک خلافت'' کے مصنف تاسیس کی تاریخ کے حوالے سے رقم طراز ہیں:''خلافت کمیٹی کب اور کیسے قائم ہوئی اس کا سراغ لگانے اورمحقق طور پر جاننے کی میں نے بڑی کوشش کی لیکن مجھے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ میں کامیاب نہ ہوسکا۔'' آگے لکھتے ہیں:''قرائن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا عبدالباری نے خلافت کمیٹی قائم کی اور پھر وہ ممبئی منتقل ہوگئی کیونکہ وہاں کے لوگوں نے اس کا بوجھ اٹھانے کہ ذمہ داری لی۔''(۱)

جبکہ شامہ محمد عثمانی لکھتے ہیں:''مولانا ابوالکلام آزاد کے دستخط سے کلکتہ کے ایک جلسہ کی خبر''مسلم آوٹ لک لندن''میں شائع ہوئی ہے اس میں مولانا نے خلافت کمیٹی کے جلسوں کی خبروں کا ذکر جس ترتیب سے کیا ہے،اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ خلافت کمیٹی کا پہلا جلسہ لکھنؤ میں ہوا تھا،اس کے بعد دہلی،امرتسر اور پھر بمبئی میں،بہرحال بمبئی میں یہ جماعت مضبوط بنیادوں پر کھڑی ہوگئی،اور سیٹھ چھوٹانی اس کے صدر ہوئے اور مولانا محمد علی جوہر نے اس کی قیادت اپنے ہاتھوں میں لی،اوراس تحریک کو چار چاند لگادیا،مشیر حسین قدوائی کا خط اوراس بنیاد پر خلافت کمیٹی کے قائم ہونے کا قصہ خود مولانا ابوالحاسن محمد سجاد نے گیا مدرسہ انوارالعلوم میں کچھ لوگوں کے سامنے بیان کیا تھا،اس مجلس میں راقم الحروف بھی موجود تھا۔''(۲)

---

(۱)تحریک خلافت:۳۸ (۲)بیسویں صدی میں تحریک خلافت:ص۲۷،بحوالہ:حسن حیات ص:۵۷

بانیانِ خلافت

قاضی عدیل عباسی تحریک خلافت کے آغاز کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''جس وقت تحریک خلافت کا آغاز ہوا مسلمانوں میں بہترین دل ودماغ رکھنے والے دانشور موجود تھے مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد، شیخ الہند مولانا محمود حسن، مفتی کفایت اللہ، مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا محمد سجاد بہاری، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی، مولانا سلامت اللہ فرنگی محلی، مولانا عبدالماجد بدایونی، مولانا سید محمد فاخر الہ آبادی، مولانا احمد سعید، مولانا سید داؤد غزنوی، مولانا آزاد سبحانی، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی، مشیر حسین قدوائی، ظفر الملک علوی، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مسٹر مظہر الحق، ڈاکٹر سید محمود آغا صفدر، اور ظفر علی خان وغیرہ۔''(۱)

محمد علی برادران

اگرچہ اس تحریک کے پیچھے ایک بڑی جماعت تھی، مگر اس تحریک کی چنگاری کو شعلہ جوالہ بنانے، ہندوستان کے کونے کونے تک متعارف کرانے اور اس میں جوش وجذبہ کی روح پھونکنے میں جو کردار محمد علی برادران نے ادا کیا ہے وہ تاریخ کے صفحات میں ایسے نقش ہیں جنہیں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔

مولانا محمد علی جوہر رامپور میں پیدا ہوئے، علی گڑھ اور آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کی، رامپور اور بڑودہ میں ملازم رہے۔ محمد علی جوہر صحافت کے راستے سے سیاست کی وادیِ پرخار میں داخل ہوئے، اردو اور انگریزی میں یکساں مہارت تھی، ہمدرد اردو اور کامریڈ انگریزی میں ان کی زودنویسی اور طوالت مضمون کے باوجود وہ دلکشی اور حلاوت ان کی تحریر میں تھی کہ وائسرائے سے لے کر قوم پرور رہنما تک سب ان کی اشاعت کے منتظر رہتے۔

چونکہ علی گڑھ سے تعلیم یافتہ تھے اس لئے علی گڑھ تحریک کا رنگ بھی چڑھا ہوا تھا اور شروع میں انگریز کے حوالے سے نرم گوشہ رکھتے تھے، مگر 1914 میں ایک دل سوز واقع پیش آیا اور آپ نے اس کے خلاف ایک مضمون شائع کردیا جو درحقیقت انگریز کے خلاف تھا، اس کے پاداش میں آپ کو نظر بند کردیا گیا، اور پھر وہاں سے ہندوستانی سیاست میں آپ کا باضابطہ ظہور ہوا۔

---

(۱) تحریک خلافت: ۳۹

1911 سے 1930 تک کی سیاست جس شخص سے غالباً سب سے زیادہ عبارت ہے وہ مولانا محمد علی ہی تھے۔ 1931 میں گول میز کانفرنس کے لئے لندن گئے جہاں انہوں نے یہ تاریخی جملہ فرمایا: ''آج جس مقصد واحد کے لئے میں یہاں آیا ہوں وہ یہ ہے کہ ارمغان آزادی میرے ہاتھ میں ہو ورنہ میں ایک غلام ملک کو واپس نہیں جاؤں گا بشرطیکہ وہ آزاد ملک ہو، پس اگر ہندوستان میں تم ہمیں آزادی نہ دو گے تو یہاں میرے لئے ایک قبر تو تمہیں دینی ہی پڑے گی''۔ایک زبردست خطیب، انگریزی اور اردو پر یکساں قدرت رکھنے والے بے مثال مدیر، انڈین نیشنل کانگریس کے صدر، تحریک خلافت کے بنیاد گزار، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بانیوں میں سے ایک، ہندوستان کی آزادی کے لیے اپنی جان قربان کرنے والے رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر نے ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو لندن کے ایک ہوٹل میں اپنی جان جاں افریں کے حوالے کردی اور ۲۴ / جنوری ۱۹۳۱ء کو بیت المقدس میں سپرد خاک ہوئے۔

انجمن موید الاسلام کے اجلاس میں تجویز خلافت

فروری 1919ء میں انجمن موید الاسلام فرنگی محل کی رپورٹ سے اندازہ ہوتا ہے، اس اجلاس میں خلافت کے تعلق سے ایک جامع تجویز منظور کی گئی تھی، پہلے اس اجلاس کی رپورٹ قاضی عدیل عباسی کی زبانی ملاحظہ فرمائیے:

> ''فروری 1919ء کے اوائل میں انجمن موید الاسلام فرنگی محل میں منعقد ہوا جس میں طے کیا گیا: احکام اسلامیہ کی رو سے بجز موجودہ سلطان ترکی کے کوئی دوسرا خلیفہ نہیں، اور شریعت اسلامیہ کی رو سے خلافت کے باب میں امت محمدیہ کے سوا غیر مسلم کی رائے بے اثر ہے، مسلمانوں نے جہاں کہیں اس بارے میں آواز بلند کی شریعت اسلامیہ کے بالکل مطابق ہے، اور یہ جلسہ اس کی تائید کرتا ہے۔''

یہ بھی طے ہوا کہ یہ جلسہ اس تجویز سے اتفاق کرتا ہے کہ ایک فتویٰ احکام خلافت سے متعلق حدود عرب وممالک اسلامیہ کے علماء کرام سے دستخط کرا کے اور مشیر قانون سے مشورہ کر کے گورنر جنرل اور وزیر ہند کی خدمت میں روانہ کیا جائے، اس سے ظاہر ہو جائے گا کہ جو خیالات اسلامی انجمنوں نے ظاہر کئے ہیں وہ احکام شریعت کے بالکل مطابق ہیں، اگر کوئی شخص اس کے خلاف ظاہر کرے تو وہ شریعت اسلامیہ کا حکم نہ سمجھا جائے اور حکومت کو غلط فہمی نہ ہونے پائے، اس جلسہ کی تجویز نمبر ۶ / لفظ بہ لفظ ذیل میں درج کی جاتی ہے:

''یہ جلسہ اس امر کو تسلیم کرتے ہوئے کہ مذہبی رواداری ہماری بنائے طاعت ہے، حضور ملک معظم کی گورنمنٹ سے اظہار وفاداری کرتے ہوئے یہ جتانا ہے کہ ممالک اسلامیہ کا عموماً اور بلاد مقدسہ کا جس میں قسطنطنیہ بھی داخل ہے خصوصا تخت خلافت سے وابستہ رہنا مذہب اسلامی کی رو سے ایک نہ بدلنے والا حکم ہے، لہٰذا اس اسلامی حکم کی رو سے مجلس ہذا گورنمنٹ برطانیہ سے پورے زور کے ساتھ متدعی ہے کہ وہ اپنا رسوخ واثر صلح کانفرنس میں بایں غرض استعمال کرے کہ جو ممالک اس جنگ میں سلطان المعظم سے علیحدہ ہو گئے ہیں وہ بجنسہ سابقہ حقوق کے ساتھ سلطان المعظم کو واپس کر دیئے جائیں، ورنہ بغیر اس کے صلح مسلمانوں کو مطمئن نہیں کر سکتی ہے۔''(۱)

اس زمانے میں تحریکِ خلافت میں مسلمانوں کے تین ہی بڑے مطالبات تھے: ترکی کی خلافت برقرار رکھی جائے، مقامات مقدسہ (مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ) ترکی کی تحویل میں رہیں اور ترکی سلطنت کو تقسیم نہ کیا جائے۔

خلافت کمیٹی کے تحت ہونے والے اہم تاریخی اجلاس اور مقاطعہ

خلافت کمیٹی کا پہلا اجلاس دہلی میں: ۲۸/صفر المظفر ۱۳۳۸ھ مطابق ۲۳/نومبر ۱۹۱۹ء کو خلافت کمیٹی کا پہلا مرکزی اجلاس دہلی میں ہوا، جس کی صدارت مسٹر فضل الحق (بنگال) نے کی، مہاتما گاندھی بھی اس اجلاس میں شریک ہوئے، اس میں خلائق کا اتنا ہجوم تھا کہ چاندنی چوک اور جامع مسجد کی راہ دو گھنٹے میں طے ہوئی، اس اجلاس میں صرف خلافت کمیٹی کے قائم مقام شریک کئے گئے جو تمام صوبوں سے آئے تھے، کچھ ہندو معززین نے بھی شرکت کی، جن کو مسلمانوں نے اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا تھا، سندھ، رنگون، بنگال، بہار، صوبہ متحدہ وغیرہ سے جو ہندو آئے تھے ان کو مسلمانوں نے خلافت کمیٹیوں کی طرف سے بھیجا تھا، شیعہ حضرات بھی اس میں شریک تھے۔(۲)

تجویز مقاطعہ

اجلاس میں باتفاق رائے یہ تجویز منظور کی گئی کہ مسلمان انگریز کے جشن فتح میں شریک نہیں ہوں گے اور اگر ان کے مطالبات منظور نہ ہوئے تو وہ حکومت سے عدم تعاون کریں گے، اس اجلاس میں ہندوؤں سے بھی

(۱) تحریک خلافت، ص:۱۱۱-۱۱۲ (۲) حوالۂ سابق: ۱۰۲

تعاون کی اپیل کی گئی۔ اس میں حضرت مولانا سجاد بھی قائدانہ طور پر شریک تھے، اس موقعہ پر جمعیۃ علماء ہند کی بھی باقاعدہ تشکیل ہوئی جس کا پہلے سے ہی عزم کر کے مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور مولانا ابوالمحاسن سجاد تشریف لائے تھے۔

خلافت کمیٹی کا دوسرا اجلاس امرتسر میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کے اجلاس کے ساتھ ۵ / ربیع ۱۳۳۸ھ مطابق ۲۸ / دسمبر ۱۹۱۹ء کو منعقد ہوا، جس کی صدارت مولانا شوکت علی نے کی، اجلاس میں حضرت مولانا عبدالباری اور حضرت مولانا محمد سجاد نے بھی قائدانہ شرکت کی، مولانا محمد علی جو ہر اجلاس سے کچھ دنوں پہلے ہی رہا ہوئے تھے، وہ بھی شریک ہوئے اور اجلاس میں ایک طویل، جذباتی اور اثر انگیز تقریر فرمائی۔ بقول مولانا عبد الماجد دریابادی: ''مولانا محمد علی جوہر کی شرکت گویا تمام مسلمانان ہند کی شرکت تھی، کیونکہ وہ اپنے علم وفضیلت، اسلام نوازی، جرآت وحق گوئی وبے باکی، عظیم ایثار وقربانی کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمہ لیڈر بن چکے تھے، بیتول جیل سے رہائی کے بعد وہ جن اسٹیشنوں سے گذرے وہاں ان کا عظیم الشان استقبال کیا گیا۔''(۱)

دہلی میں خلافت کانفرنس اور وفد خلافت کی تجویز

۲۷ / ربیع الثانی ۱۳۳۸ھ مطابق ۲۰ / جنوری ۱۹۲۰ء کو دہلی میں ایک بڑی خلافت کانفرنس ہوئی، جس میں مولانا ابوالکلام آزاد (مولانا آزاد یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو جیل سے رہا ہوئے تھے)، لوکمانیہ تلک اور دیگر کانگریسی لیڈران بھی شریک ہوئے، اور خلافت کے مسئلہ پر سب نے اپنے اتفاق کا اظہار کیا، وائسرائے اور صلح کانفرنس لندن میں وفد بھیجنے کی تجویز منظور ہوئی، مولانا محمد علی نے وفد کا میموریل تیار کیا جس پر سرآوردہ لوگوں نے دستخط کئے، مولانا آزاد نے انڈیا ونس فریڈم میں لکھا ہے:

> ''وفد وائسرائے سے ملا، میں نے عرضداشت پر دستخط تو کر دیئے تھے مگر وفد کے ساتھ گیا نہیں، کیونکہ میرا خیال تھا کہ معاملات عرضداشتوں اور وفدوں کی حد سے آگے بڑھ چکے تھے۔''(۲)

مولانا آزاد ہی کے بیان کے مطابق وائسرائے نے میموریل کے جواب میں صرف اتنا کہا کہ ''اگر مسلمانوں کا کوئی وفد حکومت برطانیہ کے سامنے ہندوستانی مسلمانوں کا نقطۂ نگاہ پیش کرنے کے لئے جانا چاہے، تو حکومت وفد کو لندن جانے کی ضروری سہولتیں فراہم کر دے گی، لیکن خود اس نے کچھ کرنے سے معذوری ظاہر کی۔''(۳)

---

(۱) تحریک خلافت، ص: ۱۰۲ (۲) انڈیا ونس فریڈم: ۸ (۳) حوالہ سابق

بر یطانیہ وفد کی روانگی

صلح کانفرنس جس کس کی شروعات 24/جنوری 1919 میں ہی ہوگئی تھی اور 1920ء میں جرمنی اور خلافت ترکیہ کی قسمت کا فیصلہ سنانے کی تیاریاں مکمل ہوچکی تھیں۔چنانچہ 1920ء جنوری کے آغاز میں مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں ایک وفد انگلستان، اٹلی اور فرانس کے دورے پر روانہ ہوا، تاکہ وزیراعظم برطانیہ اور اتحادیوں کو ان کے وعدے یاد دلائے اور اس وفد میں نامور شخصیات میں سے مولانا سید سلیمان ندوی ،سید حسین، ابوالقاسم ، اور حسن محمد حیات وغیرہ بھی شامل تھے۔ وفد نے برطانیہ پہنچ کر وزیراعظم لائیڈ جارج سے ملاقات کی،لیکن اس کا جواب''آسٹریلیا اور جرمنی سے خوف ناک انصاف ہو چکا اور ترکی اس سے کیوں کر بچ سکتا ہے۔''سن کر مایوسی ہوئی۔مولانا محمد علی نے کچھ عوامی جلسے وہاں کئے ، پھر یہ حضرات نامراد اکتوبر ۱۹۲۰ءکو ہندوستان لوٹ آئے۔(۱)

معاہدہ سیرو ے،خلافت کا زوال اور اہم دفعات

ابھی وفد کی واپسی بھی نہیں ہوئی تھی کہ 10/اگست 1920ء کو اتحادی قوتوں اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان ایک امن معاہدہ طے پایا جو معاہدہ سیورے(Treaty of Sevres) نام سے مشہور ہے اور اس پر دستخط کرنے والے رضا توفیق،فرید پاشا،ہادی پاشا اور رشید خالص تھے۔

1-حجاز(موجودہ سعودی عرب کا صوبہ) اور آرمینیا آزاد ممالک قرار دیے گئے۔

2-کردستان کو بھی آزادی ملنی تھی اور کرد ولایت موصل بھی آزاد کردستان میں شمولیت اختیار کرسکتی تھی۔

3-دوران جنگ سائیکس پیکوٹ معاہدے کے تحت بین النہرین یعنی میسوپوٹیمیا(موجودہ عراق) اور فلسطین برطانیہ کو دیا گیا تھا۔

4-لبنان اور شام کا علاقہ فرانس کے انتظام میں دے دیا گیا۔

5-بحیرہ روم میں جزائر ڈوڈ کینیز اور رہوڈز (جو 1911ء سے ہی اٹلی کے قبضے میں تھے) کے علاوہ شمالی اناطولیہ اٹلی کو دے دیا گیا۔

---

(۱)تحریک خلافت:۱۹۹-۱۲۲

6-تھریس اور مغربی اناطولیہ یونان کا حصہ قرار دیا گیا جس میں سمرنا (موجودہ ازمیر) کی اہم ترین بندرگاہ بھی شامل تھی۔

7-باسفورس، درہ دانیال اور بحیرہ مرمرہ کو غیر فوجی اور بین الاقوامی علاقہ قرار دیا گیا۔

8-عثمانی افواج کی تعداد کو 50 ہزار تک محدود کر دیا گیا۔

وفد کی اس ناکام واپسی اور جابرانہ معاہدہ سیروے کے بعد اب ہندوستان میں انگریز کے خلاف غیظ وغضب کا لاوا پھوٹ پڑا اور انگریز کی منافقانہ حرکت نے لوگوں کے ذہن ودماغ میں ان کے خلاف نفرت بھر دی، پھر دیکھتے ہی دیکھتے ملک بھر میں احتجاجات اور بڑے بڑے کانفرنس ہونے لگے، مسلم لیگ جو کانگریس کے مدمقابل مسلمانوں کی ترجمانی اور نمائندگی کے لئے بنائی گئی تھی، اس کے بعد کانگریس کے ساتھ مل کر ایک پلیٹ فارم میں جمع ہونے لگے۔

کراچی میں عظیم الشان خلافت کانفرنس

۱۵/محرم الحرام ۱۳۴۰ھ مطابق ۱۹/ستمبر ۱۹۲۱ء کو کراچی میں خلافت کانفرنس مولانا محمد علی جوہر کی صدارت میں ہوا، جس میں حسب معمول کافی جوش وخروش نظر آیا، اکابر علماء وزعماء اسلام کے علاوہ ہندو لیڈر اور عوام بھی کانفرنس میں شریک ہوئے، اسی اجلاس میں انگریزی فوج کی ملازمت کو ازروئے اسلام حرام قرار دیا گیا، اور پھر حضرت مولانا حسین احمد مدنی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا نثار احمد کانپوری، پیر غلام مجددی اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو وغیرہ پر مشہور زمانہ مقدمہ بغاوت چلا، مولانا محمد علی نے دوران مقدمہ جج سے زوردار لفظی مباحثہ کیا، حضرت مدنی بھی اپنے بیان پر قائم رہے، کراچی کے مقدمہ میں تمام ہی ملزموں نے اقبال جرم کر لیا تھا، اسی زمانے میں یہ شعر کافی مشہور ہوا:

بولیں اماں محمد علی کی — جان بیٹا خلافت پہ دے دو

ساتھ تیرے ہیں شوکت علی بھی — جان بیٹا خلافت پہ دے دو

خواتین بھی تحریک میں شامل ہوگئی تھیں، مولانا محمد علی کی والدہ اس میں پیش پیش تھیں، اور اس ضعیف العمری میں بھی ہندوستان بھر کے مختلف پروگراموں میں شرکت کرتی اور اپنے جذباتی خطابات سے لوگوں کے دلوں میں آزادی کی چنگاری جلا دیتی، جس کی وجہ سے سارا ملک ان کو بی اماں کے نام سے یاد کرتا تھا۔(۱)

(۱) تحریک خلافت: ۱۸۳-۱۹۴

تحریک خلافت سے جنم لینے والی تحریکات

جمعیت علمائے ہند کا قیام اور ترک موالات کا فتوی: انیسویں صدی کے شروع دو دہائیوں میں درجنوں تحریکیں وجود میں آئی مگر اس میں سے بیشتر نے خلافت تحریک کی کوکھ سے ہی جنم لیا جن کا مقصد اس تحریک کو مؤثر ترین بنانا تھا۔ چنانچہ نومبر 1919ء کو تحریک خلافت کمیٹی نے دہلی میں اپنی پہلی کانفرنس منعقد کی، جس میں بھارت بھر سے مسلم علماء نے شرکت کی۔ اس کے بعد ان میں سے پچیس مسلم علما کی ایک جماعت نے دہلی کے کرشنا تھیٹر ہال میں ایک الگ کانفرنس منعقد کی اور اس میں جمعیۃ علماء ہند کی تشکیل دی۔ ان سرکردہ علماء میں عبدالباری فرنگی محلی، احمد سعید دہلوی، کفایت اللہ دہلوی، منیر الزماں خان، محمد اکرم خان، محمد ابراہیم میر سیالکوٹی اور ثناء اللہ امرتسری وغیرہ شامل تھے۔ اپنے قیام کے بعد سے جمعیۃ کا مقصد ''انگریزوں سے آزاد-ہندوستان'' تھا۔

تحریک ترک موالات، ہجرت اور جامعہ ملیہ اسلامیہ

پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب تحریکِ ترک موالات کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ تحریک خلافت میں متوقع کامیابی کے بعد مسٹر گاندھی نے دوسرا قدم اٹھایا اور 1920ء میں تحریکِ ترک موالات کا اعلان کر دیا۔ 28 رمئی 1920ء کو بمبئی میں خلافت کانفرنس کا اجلاس ہوا جس میں عدم تعاون کے اصول کو تسلیم کیا گیا۔ 2رجون 1920ء کو الہ آباد میں ایک اجلاس ہوا جس میں ہندو اور مسلمان راہنماؤں نے شرکت کی۔ اس میں تحریک ترکِ موالات کی قرارداد اصولاً پاس کر دی گئی اور اس طریقہ کار کو مسٹر گاندھی کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا۔

گاندھی جی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے غیر ملکی مال کے بائیکاٹ اور نان کوآپریشن (ترک موالات) کی تجویز پیش کی، اس تحریک کو تحریک عدم تعاون بھی کہا جاتا ہے(۱)، انگریزی میں non-cooperative movement بھی کہا جاتا ہے، اس کے مندرجہ ذیل تجاویز تھیں:

- حکومت کے خطابات واپس کر دیئے جائیں۔
- کونسلوں کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا جائے۔
- سرکاری ملازمتوں سے علیحدگی اختیار کر لی جائے۔
- تعلیمی ادارے سرکاری امداد لینا بند کر دیں۔

---

(۱) ہندوستانی مسلمان، ص: ۱۵۷

- مقدمات سرکاری عدالتوں کے بجائے ثالثی عدالتوں میں پیش کئے جائیں۔
- انگریزی مال کا بائیکاٹ کیا جائے۔

دوسری طرف، 8/ستمبر 1920ء کو جمعیۃ نے ایک مذہبی فتویٰ جاری کیا، جسے فتوی ترکِ موالات کہا جاتا ہے، جس کے ذریعے برطانوی سامان کا بائیکاٹ کیا گیا۔ یہ فتوی ابوالمحاسن محمد سجادؒ نے لکھا تھا، جس پر 500 علما کے دستخط تھے۔ یہ بہت کارگر ہتھیار تھا، جو اس جنگ آزادی اور قومی جدوجہد میں استعمال کیا گیا، انگریزی حکومت اس کا پورا پورا نوٹس لینے پر مجبور ہوئی اور اس کا خطرہ پیدا ہوا کہ پورا ملکی نظام مفلوج ہوجائے اور عام بغاوت پھیل جائے، آثار انگریزی حکومت کے خاتمہ کی کی پیشین گوئی کررہے تھے، اس لئے ستمبر 1920ء تا فروری 1922ء) تحریک آزادی ہند کی پہلی کڑی مانی جاتی ہے۔

تحریک خلافت کو اور موثر بنانے کے لئے 1920ء میں تحریک ہجرت شروع کی گئی جس میں ہندوستان کو دالحرب قرار دیا گیا اور افغانستان کے امیر امان اللہ خان سے معاہدہ کے تحت وہاں ہجرت کرنے کا فتوی گیا، اس حوالے سے مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ کے علاوہ اور بھی علماء کے فتاوے نقل کئے جاتے ہیں؛ مگر سب سے سخت فتویٰ مولانا ابوالکلام آزادؒ کی جانب سے دیا گیا اور ہجرت کو فرض عین قرار دیا گیا۔ مسلمان اپنے سارے مال ومتاع کی قربانی دے کر اور اپنے اعزاء واقرباء کو خیرباد کر کے جوق در جوق افغانستان کی طرف ہجرت کرنے لگے، مگر جلد ہی افغانستان کے امیر نے التواء کی درخواست کردی اور اس کا منفی اثر پیدا ہونے لگا۔

تحریک ترک موالات میں اس بات پر زور دیا گیا کہ ہم حکومت کا تعاون نہیں لیں گے اور جمعیت کی طرف سے بھی ترک موالات کا فتوی عام کر دیا گیا تو پھر اکابرین نے اس بات کی طرف توجہ دی کہ ہم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا بھی بائیکاٹ کریں گے کیوں کہ وہ حکومت کے تعاون سے چلتی ہے اور ایک خودمختار عصری تعلیمی ادارہ قائم کریں گے، چنانچہ 29/اکتوبر 1920ء کو علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کے بانیوں میں محمود حسن دیوبندی، محمد علی جوہر، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، عبدالمجید خواجہ اور ذاکر حسین ہیں۔ ان کے بانیین کے مقاصد یہ تھے: یہ تعلیم گاہ حکومت کے اثر سے آزاد قومی اور ملی مصالح کی پابند ہو، اس کی تعلیم میں دینی اور دنیوی، قدیم اور جدید عناصر کا صحیح امتزاج ہو۔

مصطفی کمال اتاترک کی فتح

اگرچہ معاہدہ سیورے (Treaty of Sevres) کے ذریعہ اتحادی قوتوں اور سلطنت عثمانیہ کے

درمیان 1920ء میں امن معاہدہ ہوا تھا اور اس معاہدے پر عثمانی سلطنت نے دستخط کر دیے تھے لیکن اسے ترکی کی جمہوری تحریک نے مسترد کر دیا اور اس معاہدے پر عملدرآمد نہ ہو سکا۔ مصطفیٰ کمال اتاترک کی زیر قیادت اس تحریک نے معاہدے کے بعد ترکی کی جنگ آزادی کا اعلان کر دیا اور ان کی زیر قیادت ترک افواج نے یونانی افواج کو اناطولیہ سے نکال باہر کرنے کر دیا۔ 20 اکتوبر 1922ء کو امن کانفرنس کا دوبارہ آغاز ہوا اور طویل بحث ومباحثے کے بعد کانفرنس ایک مرتبہ پھر 4 فروری 1923ء کو ترکی کی مخالفت کے باعث متاثر ہوئی۔ 23 اپریل کو دوبارہ آغاز ہوا اور مصطفیٰ کمال کی حکومت کے شدید احتجاج کے بعد 24 جولائی کو 8 ماہ کے طویل مذاکرات کے نتیجے میں ایک معاہدہ پر دستخط ہوئے جسے معاہدہ لوزان کے نام سے جانا جاتا ہے۔

معاہدہ لوزان 24 جولائی 1923ء کو سوئٹزر لینڈ کے شہر لوزان میں جنگ عظیم اول کے بعد اتحادیوں اور ترکی کے درمیان طے پایا۔ معاہدے کے تحت یونان، بلغاریہ اور ترکی کی سرحدیں متعین کی گئیں اور قبرص، عراق اور شام پر ترکی کا دعویٰ ختم کر کے آخر الذکر دونوں ممالک کی سرحدوں کا تعین کیا گیا۔ اس معاہدے کے بعد 3/ مارچ 1924 کو مصطفیٰ کمال پاشا نے خلافت کے خاتمے کا اعلان کر کے ترکی کو جمہوریہ کا اعلان کر دیا اور اس طرح تقریباً چھ سو سالوں تک تین براعظموں میں پھیلی ناقابل تسخیر سمجھی جانے والی عظیم اور روحانی منصب خلافت کو یک جنبش قلم منسوخ کر دیا گیا۔

مسلمانانِ ہند کی ایک اور کوشش

اس کے بعد بھی علماء اور قائدین نے خلافت اسلامیہ کے امکانات کے لئے کئی عملی کوششیں کیں، پہلے تو یہ کوشش کی گئی کہ خود مصطفی کمال اس منصب خلافت کے لئے آمادہ ہو جائے؛ لیکن جب اس سے مایوسی ہوئی تو 1924ء میں شاہ عبدالعزیز نے حجاز مقدس میں شریف حسین کے خلاف اپنی مہم کا آغاز کیا تھا، جمعیۃ وخلافت نے علامہ سید سلیمان ندویؒ کی قیادت میں باقاعدہ ایک وفد بھی حجاز مقدس روانہ کیا تھا، لیکن یہاں بھی مایوسی کے علاوہ کچھ ہاتھ نہ آیا۔ 1925ء میں جب مکمل حجاز فتح ہوا اور 10/ جنوری 1626ء میں شاہ عبدالعزیز نے اپنے ملک النجد والحجاز ہونے کا اعلان کر دیا تو خلافت اسلامیہ کی آخری امید بھی جاتی رہی اور اس کا سورج ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔(۱)

---

(۱) بیسویں صدی میں تحریک خلافت، ص: ۴۵

تحریک خلافت کا خاتمہ اور اس کے چند محرکات

● **چورا چوری فساد:** یہ سانحہ 4 فروری، 1922ء کو اس وقت پیش آیا جب سول نافرمانی کی تحریک شباب پر تھی اور انگریز حکومت کے خلاف نفرت اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی، چنانچہ تحریک خلافت کی حمایت میں لوگوں نے مشتعل ہو کر اتر پردیش کے ضلع گورکھپور ایک گاؤں چوری چورا میں ایک تھانے کو آگ لگا دی جس میں 22 سپاہی جل مرے۔ اس واقعے کو آڑ بنا کر گاندھی نے اعلان کر دیا کہ چونکہ یہ تحریک عدم تشدد پر کاربند نہیں رہی اس لیے اسے ختم کیا جاتا ہے۔

اس واقعہ کے فوراً بعد گاندھی نے سول نافرمانی تحریک کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا کہ اس سے تشدد میں اضافہ ہو رہا ہے اور تحریک ترک موالات کا مقصد متاثر ہو رہا ہے۔ ترک موالات کی تحریک سے عام بیداری کی جو امنگ اور جذبہ تھا گاندھی جی کی اچانک کنارہ کشی سے سرد پڑنے لگا اور ہندو مسلم اتحاد و اعتماد بھی پارہ پارہ ہو گیا جس کے نتیجے میں تحریک خلافت کو بھی بڑا نقصان پہنچا اور اتنی بڑی تحریک دم توڑ گئی۔

● **مسلم قیادت کا فقدان:** ایک اہم وجہ اس کے قائدین کی نظر بندی تھی کہ اکثر مسلم قائدین جنہوں نے اس تحریک کو سنبھال رکھا تھا اس وقت سلاخوں کے پیچھے تھے یا نظر بند کر دیئے گئے تھے، جب گاندھی جی نے اپنا تعاون واپس لے لیا تو کوئی مضبوط مسلم لیڈر میدان نہیں رہے جو اس تحریک خلافت کی قیادت کر سکتے اور لوگوں کی اجتماعیت کو پارہ پارہ ہونے سے روک پاتے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ یہ تحریک مائل بہ زوال ہونے لگی۔

● **تحریک ہجرت فتوی کا ردعمل:** تحریک خلافت کو موثر بنانے کے لئے کے لئے 1920ء میں تحریک ہجرت شروع کی گئی۔ اس میں افغانستان ہجرت کرنے کے لئے کئی مؤقر شخصیات کی طرف سے فتاویٰ دیئے گئے؛ مگر سب سے سخت فتویٰ مولانا ابوالکلام آزادؒ کا تھا، انہوں نے ہجرت کو فرض عین قرار دیا تھا۔ افغانستان کے امیر امان اللہ خان کی جانب سے پہلے مہاجرین کو پناہ دینے کے بارے میں رضامندی ظاہر کی گئی مگر جب مہاجرین آنا شروع ہوئے تو امیر صاحب نے التواء کی درخواست کر دی اور اپنی سرحد بند کر کے مزید مہاجرین کا داخلہ بند کر دیا۔ پھر جس طریقے سے یہ مہاجرین واپس آئے یہ ایک دردناک داستان ہے جہاں ان کا سب کچھ لٹ چکا تھا اور وہ سڑکوں پر آ گئے تھے۔ یہ وہ چیزیں تھی جس نے مسلمانوں کو اپنے قائدین سے برہم کر دیا اور اس تحریک سے کنارہ کشی کرنے لگے۔

● **خلافت عثمانیہ کے خاتمے کا اعلان:** اور سب سے اہم وجہ خود ترکی حکمراں مصطفیٰ کمال پاشا نے کی طرف سے خلافت کے خاتمے کا اعلان تھا کہ انہوں نے اپنی صدارت کا اعلان کر کے اسے ایک جمہوری ملک بنا دیا اور دوسری طرف سعودی عرب سے امید تھی کہ شاہ عبدالعزیز اپنی تحریک میں کامیابی کے بعد خلافت کا اعلان کریں مگر حکومت ہاتھ آئی تو انہوں نے بھی ملک النجد والحجاز کے طور پر اپنے نام کا اعلان کر دیا۔ جب خلافت کے بقاء کی ساری ممکنہ صورتیں ختم ہو گئیں تو یہ تحریک بھی سرد پڑ گئی اور اس کی مزید ضرورت بھی محسوس نہیں رہی اور 1924 میں یہ چراغ ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا۔

ہندوستان کی آزادی میں تحریک خلافت کا کردار

اگر چہ تحریک اپنے اصل مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکی مگر اس نے ہندوستان میں آزادی کا بگل بجا دیا، نئی سوچ وفکر دی، نئی امنگ اور حوصلہ دیا، ان میں خود اعتمادی پیدا کر دی۔ اس نے 1857 کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد پہلی مرتبہ منظم طور پر غیر ملکی حکمرانوں کے سامنے ایک چیلنج پیش کیا اور ہندوستانیوں کو صرف حکومت میں شرکت کی نہیں؛ بلکہ مکمل آزادی کا خواب دکھایا۔ اس نے ہندو مسلم اتحاد کی نیوڈال دی، یہ تحریک سیاسی شعور بیدار کرنے میں سنگ میل ثابت ہوئی اور مضبوط، پختہ اور طاقتور قیادت کو جنم دیا، اور اس کے بعد سے تحریک آزادی بدستور قوی تر اور انگریز حکمران بہ باطن کمزور تر ہوتے چلے گئے۔ جنہیں انگریز اپنے قریب بٹھانا بھی پسند نہیں کرتے تھے انہیں بات چیت کی میز پر دعوت دینے لگے اور یہ کہنا بجا ہو گا کہ 15 / اگست 1945ء کا یہ دن دراصل تحریک خلافت کا ایک ذیلی ثمر اور نتیجہ تھا۔

○○○

تحریک ترکِ موالات

مولانا محمد انصار اللہ قاسمی ❖

وطن عزیز کو برطانوی سامراج کے ظالمانہ اور غاصبانہ اقتدار سے آزاد کرانے کے لئے آزادیٔ وطن کی جنگ لڑی گئی، یہ جنگ مختلف مرحلوں میں الگ الگ تحریکوں کے نام سے لڑی گئی، ان تحریکوں میں ایک اہم اور نمایاں نام ''تحریک ترکِ موالات'' کا ہے، یہ تحریک آزادی کے سفر کو منزل مقصود تک پہنچانے میں اہم سنگ میل ثابت ہوئی، تحریک ترکِ موالات سے آزادیٔ وطن کے جیالوں اور جانبازوں کو نشانِ منزل کا پتہ لگا اور وہ اپنے ہم سفروں کے لئے مشعلِ راہ بنے، اس تحریک کے مقاصد اور اس کے اثرات وثمرات کو جاننے اور سمجھنے کے سلسلہ میں چند اہم تفصیلات اور ضروری معلومات پیشِ خدمت ہیں:

۱- نام

تحریک کا نام ''ترکِ موالات'' ہے، اِس کو ''تحریک عدمِ تعاون'' بھی کہا جاتا ہے، اور انگریزی میں یہ تحریک "Non-cooperation movement" کے نام سے مشہور ہے۔

۲- تحریک کا آغاز وپس منظر

تحریک ترکِ موالات کے شروع ہونے سے پہلے ہندوستان میں ''تحریک خلافت'' کا آغاز ہو چکا تھا، تحریک خلافت کے آغاز میں یہ بات ہے کہ ۱۹۱۸ء میں برطانیہ اور جرمنی کے درمیان پہلی جنگ عظیم ختم ہوئی، اس جنگ کے بعد برطانوی حکومت نے خلافت اسلامیہ کے مرکز ترکی سے بے وفائی اور بدعہدی کی، اس کے نتیجہ میں خلافت کا خاتمہ ہوگیا، ترکی کی خلافت عثمانیہ اگر چہ ایک کمزور و بے جان خلافت تھی، مگر اس کی خاص مذہبی ودینی حیثیت کی وجہ سے پوری دنیا کے مسلمانوں پر اس کا ایک خاص اثر اور رعب ودبدبہ تھا، اس وجہ سے

❖ استاذ شعبہ مطالعۂ مذاہب: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

معاصر حکمرانوں کوترکی کی حکومت سے ایک انجان سا خوف اور اندیشہ لگا رہتا تھا، خلافتِ عثمانیہ کے سقوط کے بعد ہندوستانی مسلمانوں میں شدید غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔

اس کے بعد ۱۹۱۹ء میں ہندوستان میں برسراقتدار برطانوی سامراج کے خلاف ترکی حکومت کے تئیں اپنے دینی وملی جذبات کے اظہار کے لئے یہاں کے مسلمانوں نے خلافت کمیٹی قائم کی، ہندوستان کی سیاست میں ''علی برادران'' کے نام سے مشہور ومعروف دوسرکردہ رہنما مولانا محمد علی جوہر (۱۸۷۸ء-۱۹۳۱ء) اور مولانا شوکت علی (۱۸۷۳ء-۱۹۳۸ء) تحریک خلافت کے روحِ رواں تھے، تحریک خلافت کے زمانہ میں خلافت کے تعلق سے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کی ترجمانی کے لئے یہ شعر بہت مشہور ہوا:

بولیں اماں محمد علی کی　　　جان بیٹا خلافت پہ دے دو

اسی تحریک خلافت کی کوکھ سے ''تحریک ترکِ موالات'' کا جنم ہوا، مورخہ ۹/جون ۱۹۲۰ء کو خلافت کمیٹی نے الٰہ آباد (پریاگ راج) میں منعقدہ اجلاس میں ترکِ موالات تحریک سے متعلق قرارداد منظور کی، اس کے بعد مورخہ ۲۲/جون ۱۹۲۰ء وائسرائے ہند کو پیغام بھیجا کہ اگر ترکوں کی شکایات دور نہیں کی گئیں تو تحریک عدم تعاون شروع کردی جائے گی، وائسرائے ہند کی طرف سے اس پیغام کا کوئی جواب نہیں دیا گیا، پھر لگ بھگ دوڈھائی مہینہ کے بعد مورخہ ۳۱/اگست ۱۹۲۰ء کو تحریک ترکِ موالات کا باضابطہ آغاز کردیا گیا۔

۳-تحریک کی تائید وحمایت میں فتویٰ

مسلمان صرف دینی مسائل اور مذہبی معاملات میں ہی نہیں بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں شریعت کا پابند ہے، کیونکہ دیگر مذاہب کے پیروکاروں کی طرح مسلمانوں کے نزدیک دین ومذہب کا تصور صرف چند مذہبی رسومات وعبادات اور ذاتی زندگی تک محدود نہیں ہے، تحریک ترکِ موالات اگر اپنے خاص پسِ منظر میں ایک سیاسی مسئلہ ہے، لیکن ایک سچے اور پابند شریعت مسلمان کے لئے وہی سیاست قابل قبول ہے، جو دین وشریعت سے متصادم نہ ہو، بقول شاعر مشرق علامہ اقبال:

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو　　　جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اس لئے از روئے شرع ترکِ موالات کا اقدام صحیح ہے یا نہیں؟ علماء دین ومفتیان شرع متین نے اِس کا جائزہ لیا، پھر کتاب وسنت کے دلائل کی روشنی میں اس کے جائز ہونے کے سلسلہ میں فتویٰ جاری کیا، تا کہ دین پسند عام مسلمانوں کو اس تحریک کو قبول کرنے اور اس سے وابستہ ہونے میں کوئی پس وپیش نہ ہو۔

دوسرے یہ کہ دین بیزاری، شریعت سے دوری اور بے رخی کے اس گئے گزرے دور میں بھی فتوی کی اپنی خاص اہمیت وافادیت ہے، اسلامی تاریخ میں کسی بھی تحریک کی تائیدوحمایت یا مخالفت کے لئے مسلمانوں کے رائے عامہ کو ہموار کرنے اور سازگار بنانے میں فتوی کا اہم اور نمایاں کردار رہا ہے، انگریزوں کے خلاف حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے سب سے پہلے جنگ آزادی کا فتوی دیا، اس کے بعد جنگ آزادی کی تحریک میں شرکت وشمولیت کے لئے مسلمانوں میں ایک نیا جوش وجذبہ پیدا ہوا۔

بہرحال تحریک ترک موالات کی تائید میں فتوی جاری کرنے کے پس پردہ فتوی کی یہی اہمیت اور حیثیت کارفرما تھی، نومبر ۱۹۲۰ء میں دہلی میں جمعیۃ العلماء کا اجلاس منعقد ہوا، اسیر مالٹا شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ نے اجلاس کی صدارت کی، اس اجلاس میں مولانا سعید احمد دہلویؒ ناظم جمعیۃ العلماء نے ترکِ موالات کی تجویز پیش کی، مولانا مرتضی حسن چاندپوریؒ، مولانا داود غزنویؒ، مولانا عبدالحلیم صدیقیؒ لکھنوی، مولانا ابوالوفاء ثناء اللہ امرتسریؒ اور دیگر سرکردہ علماء نے ترکِ موالات تجویز کی بھرپور تائید کی۔

بلند پایہ عالم دین، فقیہ النفس اور بالغ نظر ملّی وسیاسی رہنما حضرت مولانا ابوالمحاسن سجادؒ ناظم جمعیۃ العلماء ہند نے اِس تجویز کو باضابطہ ایک فتوی کی شکل میں پیش کیا، ۱۳۴۰ھ میں سات صفحات پر مشتمل ایک رسال کی شکل میں ''علماء ہند کا متفقہ فتویٰ'' کے عنوان سے یہ فتویٰ شائع ہوا، رسالہ کے سرورق کی پیشانی پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے:

> ''مسلمانو! تم کو آرام نہیں لینا چاہئے، جب تک کم از کم دس مسلمانوں تک وہ احکام نہ پہنچادو جو اِس رسالہ میں درج ہیں۔''

حضرت مولانا ابوالمحاسن سجادؒ نے اس اہم اور تاریخی فتوی کو قرآن مجید کی مختلف آیات سے مدلّل فرمایا، مثلا:

(۱) لَّا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ...الخ (الممتحنہ:۸)

(۲) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ...الخ (المائدہ:۵۱)

(۳) وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ...الخ (المائدہ:۲)

(۴) وَمَن يَتَوَلَّهُمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ...الخ (الممتحنہ:۹)

اس فتوی پر مختلف مکاتب فکر سے وابستہ وقت کے نامور علماء ومفتیان اور مشائخ نے تائیدی دستخط کئے، ان میں خصوصیت کے ساتھ حضرت مولانا خلیل الرحمٰنؒ سہارنپوری، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، حضرت مولانا عبدالباریؒ لکھنوی فرنگی محلی، حضرت مولانا عبدالقدیر قادریؒ بدایونی، حضرت مولانا سید حسین احمدؒ مدنی، حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، حضرت مولانا ادریس کاندھلویؒ اور حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ کے نام قابل ذکر ہیں۔

انگریز حکمرانوں نے تحریک ترکِ موالات کی حمایت میں فتوی کی اشاعت کو اپنے لئے شدید خطرہ سمجھا اور اس کو اعلانِ بغاوت تصور کرتے ہوئے فتوی کی کاپیاں ضبط کر لی گئیں، ستمبر ۱۹۲۱ء میں فتوی پر دستخط کرنے والے جمعیۃ العلماء اور خلافت کمیٹی کے رہنماؤں کو ملک کے مختلف شہروں سے گرفتار کرلیا گیا، اُن پر مقدمہ چلا کر اُنھیں دو دو سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔

۴-تحریک کا مقصد اور پیغام

تحریک ترکِ موالات کا مقصد اور پیغام یہ تھا کہ خلافت عثمانیہ کے تحت برسر اقتدار ترک حکمرانوں کے ساتھ برطانوی حکومت کی بدعہدی اور بے وفائی پر احتجاج کیا جائے، اور خلافت عثمانیہ کے سقوط پر بحیثیت مسلمان اپنے غم وغصہ کا اظہار کرتے ہوئے ترک اور پوری دنیا کے مسلمانوں کو اسلامی اخوت و بھائی چارگی اور دینی وحدت ویکجہتی کا پیغام دیا جائے، اس کے لئے ہندوستان پر قابض برطانوی حکومت کے ساتھ عدم تعاون کا رویہ اختیار کیا جائے اور ہر ہندوستانی شہری حسب ذیل امور کو روبہ عمل لا کر اس کا ثبوت دے:

۱-انگریز حکومت کی طرف سے دیے گئے تمام خطابات واعزازات کو چھوڑ دینا، مثلاً ''سر'' وغیرہ۔

۲-حکومت کی کونسلوں سے اپنی رکنیت ختم کر لینا اور دوسرے امیدواروں کے لئے بھی ووٹ نہ دینا۔

۳-کسی ایسی تجارت میں شامل نہ ہونا، جس سے انگریز حکومت کو فائدہ ہو۔

۴-کالجوں اور اسکولوں کے لئے سرکاری امداد قبول نہ کرنا اور نہ سرکاری یونیورسٹیوں سے کوئی تعلق رکھنا۔

۵-انگریز حکومت کی فوج میں ملازمت نہ کرنا اور نہ ہی انھیں کسی قسم کی فوجی امداد پہنچانا۔

۶-انگریز حکومت کی عدالتوں میں مقدمات نہیں لے جانا اور وکلاء کا بھی مقدمات کی پیروی نہ کرنا۔

۵-تحریک کے اہم واقعات اور شخصیات

تحریکِ ترکِ موالات کو آگے بڑھانے اور بلا لحاظ مذہب وملت تمام ہندوستانی شہریوں کو اس تحریک سے جوڑنے میں حسب ذیل اہم اور سرکردہ شخصیات نے نمایاں اور قائدانہ کردار ادا کیا:

شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ، شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا حسرت موہانیؒ، مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا شوکت علیؒ اور گاندھی جی وغیرہ۔

اس تحریک کے دوران پیش آئے اہم واقعات میں سے دو واقعات خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ایک واقعہ ''مقدمۂ کراچی'' کے عنوان سے مشہور ہے، ۲۰ رستمبر ۱۹۲۱ء کو پڑوسی ملک پاکستان کے مشہور شہر کراچی میں مولانا سید حسین احمد مدنیؒ پر اس لئے مقدمہ چلایا گیا کہ آپ نے برطانوی حکومت کی پولیس اور فوج میں ملازمت کے حرام ہونے سے متعلق فتوی دیا تھا، اس مقدمہ میں مولانا مدنیؒ کے ساتھ مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا نثار احمد اور پیر غلام مجدد کو بھی دو سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی اور ان حضرات کو احمد آباد گجرات کی سابرمتی جیل بھی دیا گیا۔

دوسرا واقعہ ضلع گورکھپور یوپی کے علاقہ ''چوری چورہ'' میں پیش آیا، یہاں سرکاری افسران اور پولیس عہدیداران نے تحریک ترکِ موالات کے کارکنان کے خلاف سخت کاروائیاں کیں، ان کارکنان کی حمایت میں کانگریس کے رہنماؤں نے زبردست احتجاج کیا اور جلوس نکالا، پولیس فائرنگ کی وجہ سے یہ جلوس اور احتجاجی قافلہ پرتشدد ہوگیا، اس تشدد میں تحریک ترکِ موالات کے تین آدمی مولوی نذر علی، رام کھلاون اور بھگوان یادو شہید ہو گئے، اس پر جلوس میں شامل افراد اور مشتعل ہو گئے، اور پولیس اسٹیشن کو آگ لگادی، جس سے لگ بھگ بیس عہدیدار آگ کی نذر ہو گئے۔

اس وقت تحریک کی قیادت گاندھی جی کے ہاتھوں میں تھی، وہ ان پرتشدد کاروائیوں کی وجہ سے دل برداشتہ ہو گئے، انھوں نے عجلت میں اور تحریک کے دیگر سرکردہ رہنماؤں سے استصواب رائے کئے بغیر تحریک واپس لینے کا اعلان کردیا، برطانوی حکومت نے اس اعلان کی پروا کئے بغیر ان پرتشدد واقعات کے حوالہ سے تحریک سے وابستہ افراد پر مقدمہ چلایا، اس کے مقدمہ کے فیصلہ میں ۱۹ر افراد کو سزائے موت سنائی گئی، ۱۶ر افراد کو عمر قید کی اور ۹۳ر افراد کو مختلف المیعاد سزائیں سنائی گئیں۔ بہرحال گاندھی جی کی تلون مزاجی اور

غیر دانشمندانہ فیصلہ کی وجہ سے تحریک ترکِ موالات اپنے کامیاب انجام کو پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہوگئی۔

۶-تحریک کے اثرات وثمرات

تحریک ترکِ موالات اگرچہ فیصلہ کن انجام کو نہیں پہنچ سکی، لیکن اس تحریک نے ملک کے سیاسی ماحول کو گرما دیا، عوام میں ملک پر قابض انگریز حکمرانوں کے خلاف غصہ اور ناراضگی پہلے سے زیادہ اور بڑھ گئی، چنانچہ اس تحریک کے نتیجہ میں ودیشی مال کا بائیکاٹ کیا گیا، دیسی صنعت کو رواج دے کر اسے مضبوط کیا گیا، اس سلسلہ میں عام لوگوں کا جوش وجذبہ اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ چوراہوں پر ولایتی کپڑوں کے ڈھیر لگا کر آگ لگا دی جاتی۔ راہ چلتے لوگ اپنے ولایتی کپڑے نکال کر آگ میں جھونک دیتے، ترکِ مولات تحریک کی وجہ سے تمام سرکاری تعلیمی اداروں میں نظامِ تعلیم معطل کر دیا گیا، عدالتوں کے بالمقابل شہروں اور قصبوں میں پنچایتیں بنائی گئیں، اس طرح عدالتوں میں مقدمات نہ ہونے کی پر وکلاء ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے، سرکاری پولیس سے کام لینے کے بجائے عوام رضا کارانہ طور پر پولیس کے فرائض انجام دینے لگی، یوں نظامِ حکومت درہم برہم ہوگیا اور حکومت کی انتظامی مشنری مفلوج ہوکر رہ گئی۔

۷-تحریک کا سبق اور پیغام

تحریک ترکِ موالات کے مطالعہ اور تجزیہ کے بعد جو پیغام اور سبق ملا وہ کچھ اس طرح ہے:

الف: ترکِ موالات تحریک کا آغاز خلافتِ عثمانیہ کے سقوط کی بنیاد پر ہوا، خلافت مسلمانوں کا ایک دینی مذہبی نظریہ ہے، اس نظریہ کی وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں اور ترکوں میں اسلامی اخوت کا رشتہ قائم تھا، اس رشتہ کی بناء پر مسلمانوں نے ترکوں کے ساتھ ہمدردی ودردمندی کا اظہار کیا، ورنہ ان دونوں کے درمیان کوئی قومی اور وطنی رشتہ نہیں تھا کہ جس کو نبھانے کے لئے ترکی حکومت کے تئیں دلی جذبات کا اظہار کیا جاتا، چنانچہ معلوم ہوا کہ ملکی مسائل اور معاملات میں بعض مرتبہ حالات کچھ اس رخ پر چلے جاتے ہیں کہ قومیت کے بجائے اسلامی اخوت کو اہمیت دینا ضروری ہوجاتا ہے، اس موقع پر مسلمان برادرانِ وطن کو اپنے ساتھ لے سکتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر ان کے ساتھ کھڑے بھی ہوسکتے ہیں، اگر دنیا میں برادرانِ وطن کے مذہبی معاملات کو لے کر اُن کے ساتھ ناانصافی ہوتی ہے۔ یا اُن کے ساتھ غلط کیا جاتا ہے، تو ہم وطنی بھائی کی حیثیت سے برادرانِ وطن کے ساتھ ناانصافی کے خلاف ضرور کھڑے ہوں۔

ملک کے موجودہ حالات اور برسرِ اقتدار پارٹی کی خاص سوچ اور آئیڈیالوجی کی وجہ سے ''قوم پرستی'' کی اصطلاح اپنے نئے معنی ومفہوم کے ساتھ سامنے آرہی ہے، بعض ناواقف اور نادان مسلمان اس کی زد میں آرہے ہیں اور وہ بلا سوچے سمجھے ضرورت سے زیادہ بے ڈھنگے انداز میں اپنی مزعومہ قوم پرستی کا اظہار کررہے ہیں، اس کی وجہ سے ''ہندوستانی قومیت بہ نام اسلامی اخوت'' کی ایک نئی بحث شروع ہوسکتی ہے۔

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ مسلمان اس ملک کے باوقار اور عزت دار شہری ہیں، وہ یہاں کرایہ دار نہیں حصہ دار ہیں، برادرانِ وطن کے ساتھ اُن کا مضبوط قومی رشتہ ہے، اب اگر برسرِ اقتدار پارٹی اپنی خاص آئیڈیالوجی کی بنیاد پر دنیا کے کسی مسلم ملک کے خلاف اپنی ''قومی پالیسی'' بناتی ہے اور اس موقع پر ملک کی دوسری بڑی اکثریت مسلمان شہریوں کے جذبات کو نظر انداز کردیتی ہے، تو کیا مسلمان ''نظریہ قومیت'' کے تحت اس مخصوص ''قومی پالیسی'' کے پابند رہیں گے اور مسلم ملک کے تئیں اپنے ''اسلامی اخوت'' کے رشتہ کو نظر انداز کردیں گے؟ مثلاً موجودہ عالمی منظرنامہ میں غاصب اسرائیل اور غزّہ کی حریت پسند تحریک حماس کا معاملہ ہے، اسرائیل کی موجودہ حکومت ہر دن غزہ کے نہتے مسلمانوں پر ظلم وبربریت اور درندگی وسفاکیت کا ایک نیا رکارڈ بنارہی ہے، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کی شہادت سے ایک خون آشام تاریخ لکھی جارہی ہے، انصاف پسند کھل کر غاصب اسرائیل کی مذمت کررہے ہیں، اور انسانی حقوق کے بعض نام نہاد علمبرداروں اور دعویداروں کا انصاف پسندی اور انسانیت نوازی کے معاملہ میں دوہرا معیار اور رویہ کا بھی اظہار ہوچکا ہے۔

فکری ونظریاتی قربت اور فسطائی سوچ کی یکسانیت کی بنیاد پر ملک کے وزیر اعظم کی اسرائیلی وزیر اعظم سے گہری دوستی مشہور ہے، حماس اور اسرائیل کی جنگ میں وزیر اعظم مودی کا ابتدائی بیانیہ بالکل یک طرفہ تھا، قریب تھا کہ یہی بیانیہ ملک کی خارجہ پالیسی بن جاتی، لیکن دوسرے تیسرے دن وزارتِ خارجہ کی طرف سے الگ بیان دے کر ملک کی خارجہ پالیسی کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی۔

حماس اور اسرائیل جنگ کے حوالہ سے اگر ملک کی خارجہ پالیسی یک طرفہ طور پر اسرائیل کی تائید وحمایت ہوتی تو یہ خارجہ پالیسی بھارت کی دوسری بڑی اکثریت یعنی ہم مسلمانوں کے لئے ناقابل قبول ہوتی، اِس پالیسی کی بنیاد پر غزہ کے مظلوم بھائیوں کے ساتھ ہم اسلامی اخوت کے رشتہ کو نظر انداز نہیں کرسکتے، جمہوری حق کا استعمال کرتے ہوئے حکومت کی خارجہ پالیسی کے خلاف اپنا احتجاج درج کرواتے، جیسا کہ امریکہ اور دیگر یورپی ممالک کی انصاف پسند عوام اپنی حکومتوں کی پالیسی کے خلاف فلسطین کی تائید میں اپنا احتجاج درج کرارہے ہیں۔

ب: تحریک ترکِ موالات میں برادرانِ وطن کے سرکردہ سیاسی رہنماؤں کی سرگرم شرکت وحمایت سے یہ بات بخوبی واضح ہوگئی کہ قومیت اور وطنیت کے رشتہ نے تمام ہندوستانیوں کو ایک مضبوط لڑی میں باندھ رکھا ہے، اس لئے مسئلہ ملک اور وطن کا ہو یا خود مختلف مذہبی برادریوں کا اپنا الگ مذہبی معاملہ ہو، بھارت واسیوں نے متحدہ طور پر اپنی ''قومی یکجہتی'' کا ثبوت دیا ہے، ورنہ ہندو سیاسی قائدین کو مسلمانوں کے مذہبی نظریہ خلافت سے جڑی ایک تحریک کا سرگرم حصہ بننے کی کوئی ضرورت نہیں تھی، قائدین تحریک ترکِ موالات میں اپنی سرگرم شرکت کو لے کر اتنا زیادہ پرجوش تھے کہ وہ خلافت کمیٹی کے عوامی جلسوں میں خلافت سے متعلق بلاتکلف آیات واحادیث سے اپنی تقریروں کو مدلل ومزین کرتے تھے۔

ملک کے موجودہ حالات میں اس کی بہت ضرورت ہے کہ فرقہ واریت اور ظلم وناانصافی کے خلاف مسلمان اپنی جدوجہد میں انصاف پسند برادرانِ وطن کی بھی شرکت وشمولیت کو یقینی بنائیں، پوری معقولیت اور معروضیت کے ساتھ حقیقت پسندانہ تجزیہ کی روشنی میں انھیں اپنا موقف سمجھایا جائے، ملک کی دوسری بڑی اکثریت کو بالکل دیوار سے لگادینے پر ملک کی ہمہ رنگ شناخت اور شان کو جو نقصان پہنچ سکتا ہے وہ بتایا جائے۔

ج: تحریک ترکِ موالات میں مسلمان لیڈروں نے وسعت قلبی، اعلیٰ ظرفی اور کشادہ ذہنی کا مظاہرہ کیا اور تحریک کی قیادت گاندھی جی کے ہاتھ میں دے دی، افسوس کہ گاندھی جی مسلم قائدین کے اعتماد وبھروسہ کو قائم نہیں رکھ سکے، انھوں نے چوری چورہ کے پُرتشدد واقعہ کو بنیاد بنا کر تحریک کو واپس لینے اور ختم کردینے کا اعلان کردیا، اِس اچانک اور جلد بازی پر مبنی فیصلہ سے مسلم قائدین اور عوام کے درمیان گاندھی جی کی شبیہ شدید متأثر ہوئی اور بجا طور پر غلط فہمیوں وبدگمانیوں کو راہ ملی۔

ملک کے موجودہ ماحول میں مسلمان اپنے دینی تشخص اور ملی شناخت کو لے کر اپنے وجود اور بقاء کی جنگ لڑ رہے ہیں، اس جنگ میں انصاف پسند برادرانِ وطن کو ضرور ساتھ لیں؛ لیکن قیادت اپنی ہی رکھیں، ورنہ دوسروں کو قیادت سونپ کر مطمئن اور یکسو ہوجانے کی سزا مسلمان آج بھی بھگت رہے ہیں، گذشتہ اور موجودہ مسلم رہنماؤں کو اس کا تلخ تجربہ ہوچکا ہے، بعض معروف سیاسی منصوبہ ساز مثلاً پرشانت کشور وغیرہ کا بھی ماننا ہے کہ مسلمان اپنی لڑائی خود لڑیں اور آنکھ بند کرکے نام نہاد سیکولر قائدین کے پیچھے نہ چل پڑیں۔

○○○

ہندوستان کی آزادی میں علماء کا کردار

خالدسیف اللہ رحمانی

آج ہمارا ملک آزاد ہے، اس کے دروبست آزاد ہیں، ہم خود اس کی تقدیر کے مالک ہیں اور اس کے سیاہ وسفید کا فیصلہ کرتے ہیں، لیکن ہماری تاریخ میں ایک ایسا دور بھی گزرا ہے، جب ہم خود اپنے وطن میں غلامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے، ہم اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کے مجاز نہیں تھے —— ہمیں یہ آزادی کیونکر حاصل ہوئی؟ اس آزادی کے جبین وعارض پر کس کس کے خونِ شہادت کی سرخی ہے؟ ضروری ہے کہ ہم اپنی تاریخ کے ان سپوتوں، مادر وطن کے لائق فرزندوں اور اس کی عزت وناموس کے ان پاسبانوں کی یاد تازہ کریں۔

ہندوستان کی آزادی کی تاریخ دنیا کے تمام انقلابات سے اس حیثیت سے جداگانہ ہے کہ ہندوستان کی آزادی کی لڑائی میں مذاہب اور مذہبی قائدین کا نمایاں کردار رہا ہے، بابائے قوم مہاتما گاندھی جی، مفسر قرآن مولانا ابوالکلام آزاد اور سکھ مذہبی رہنما تاراسنگھ یہ سارے لوگ وہ تھے، جو مذہب کی آغوش میں پلے اور ساری زندگی مذہب کے زیر سایہ گذاردی، —— اسی پس منظر میں اس وقت ہمارا موضوع ''ہندوستان کی آزادی میں مسلمان علماء کا کردار'' ہے۔

1600ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں قدم رکھا اور بتدریج اپنی فوج اور پولیس بھی رکھنی شروع کردی، یہاں تک کہ ہندوستانیوں سے انگریزوں کا پہلا معرکہ 1757ء میں پلاسی کے میدان میں پہلے شہید آزادی سراج الدولہ کے ساتھ ہوا، یہ گویا انگریزوں کی طرف سے اس امر کا اعلان تھا کہ وہ اس ملک میں محض تجارت پر قناعت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں؛ بلکہ اس ملک کی سیاسی تقدیر بھی اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں۔

انگریزوں سے دوسرا بڑا معرکہ 1764ء میں بکسر کے میدان میں میر قاسم کے ساتھ ہوا اور اس میں بھی میر قاسم کو شکست ہوئی، ادھر جنوب میں فرمانروائے میسور سے انگریزوں کی تین جنگیں ہوچکی تھیں، جن میں دوبار انگریز شکست کھا چکے تھے، 1799ء میں آخری معرکۂ میسور ہوا اور بعض مسلم والیان مملکت کی غداری و جفا

کاری کے باعث یہ معرکہ بھی ہندوستانیوں کے خلاف رہا، اسی معرکۂ میسور نے 1806ء میں اس تحریک کی صورت اختیار کی جو ''غدر ویلور'' کہلاتا ہے، اور جس کو بعض مؤرخین نے 1857ء کی تحریک حریت کا ریہرسل قرار دیا ہے، بقول جنرل برگس:

> ''جنوب میں ہمارے اقتدار کو مٹانے کے لئے غیر مطمئن مسلمانوں کی طرف سے یہ پہلی کوشش تھی، اسی طرح آپ کو تاریخ میں یہ واقعہ بھی ملے گا کہ 1857ء کے واقعہ میں سرنگا پٹنم کے مسلمانوں نے سلطان ٹیپو شہید کی قبر پر جا کر مجاہدین کی فتح کے لئے دعاء کی۔''(۱)

جہاں مرشد آباد اور بکسر کی شکست نے بنگال سے نواح دہلی تک انگریزوں کو غلبہ عطا کر دیا، وہیں میسور کی فتح نے جنوب میں انگریزوں کے لئے مزاحمت ختم کر دی اور حقیقت یہ ہے کہ خود دہلی میں بھی مغلیہ حکومت کی شمع سحری 16 ستمبر 1803ء ہی کو بجھ گئی تھی، جس دن شہنشاہ عالم نے برطانیہ کی سرپرستی قبول کر لی تھی۔

ہندوستانی کسانوں پر ٹیکسوں کا ناواجبی بوجھ، مقامی صنعتوں کی تباہی و بربادی اور ملک کے اصل باشندوں کے ساتھ تذلیل وتحقیر کے سلوک نے محبان وطن کو بے چین و بے قرار کر دیا اور یہ بے قراری آخر 1857ء کی تحریک کی صورت آتش فشاں بن کر پھوٹ پڑی، یہ وہ نشہ تھا جس نے ہندو اور مسلمان، برہمن اور شودر، زمیندار اور جاگیردار اور زارع و کاشتکار سبھوں کو ایک صف میں لاکھڑا کیا، غور کیا جائے اور بہ نظر انصاف دیکھا جائے تو آزادی کے لیے ان تمام اہم معرکوں میں مسلمان پیش پیش تھے اور انہوں نے دشمنان وطن کو خون جگر کے جام بھر بھر کر دیئے کہ ان کی تشنہ کامی دور ہو اور وطن عزیز کی عزت وآبرو سلامت رہ جائے۔

انگریزوں نے ہندوستان میں جو علاقے چھینے تھے، ان میں مراٹھوں، راجپوتانہ اور پنجاب کا علاقہ چھوڑ کر قریب قریب سبھی مسلمانوں ہی کے زیر اقتدار تھے؛ اس لئے مسلمان ہی ان کا زیادہ نشانہ تھے اور فطری طور پر مسلمان ہی ان سے نبرد آزما بھی تھے، سرولیم میور نے جو انٹلی جنس ریکارڈ جمع کیا ہے، اس کے مطابق ''بد ذات مسلمانوں کو عبرت دلانے کے لئے جھجر، بلب گڑھ، فرخ نگر کے نوابوں اور 24 شہزادوں کو پھانسی پر لٹکایا گیا''(۲)، مسلمانوں کی جائیدادیں ضبط کر لی گئیں یا تباہ کر دی گئیں اور مسلمانوں سے ان کی غیر منقولہ جائیداد کا 35% بہ طور تعزیری جرمانہ وصول کیا گیا، جب کہ ہندوؤں کو 10 فیصد کے ساتھ چھوڑ دیا گیا، اور جب دوبارہ

(۱) مقالہ: کے، ایم اشرف، انقلاب 1857ء
(۲) سرولیم میور: انڈین ملٹری انٹلیجنس ریکارڈ: ۱/ ۲۷۳، 1902ء

دہلی فتح ہوا تو ہندوؤں کو تو چند ہی ماہ میں واپسی کی اجازت مل گئی ،لیکن مسلمان 1859ء سے پہلے نہ لوٹ سکے، ریکس کا بیان ہے: ''مسلمان باغی کا مترادف کلمہ تھا۔''(۱)

1857ء کے انقلاب کے بارے میں پنجاب کی انگریزی سرکار نے شروع ہی سے اعلان کر دیا تھا کہ بغاوت کا آغاز دراصل ہندوستانیوں اور مسلمانوں کی طرف سے ہوا،مسلمانوں کو بہ قول کیو براؤن بغاوت کا محرک سمجھا جاتا تھا اور ہندوؤں کو ان کا آلہ کار،سندربن کے انگریز کمشنر نے باضابطہ گورنمنٹ گزٹ میں اعلان کیا کہ جو ملازمتیں خالی ہوتی ہیں،ان پر سوائے ہندوؤں کے کسی کا تقرر نہ کیا جائے؛(انقلاب 1857،ص:۳۵) اس لیے یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کا سب سے نمایاں حصہ رہا ہے اور انہوں نے اس میں پیش قدمی بھی کی ہے،اور چونکہ ہر دور میں مسلمان ہر نئے قدم کے لیے علماء کی طرف دیکھتے رہے ہیں اور ان کے اشارۂ انگشت میں اپنے لیے دین ودنیا کی بھلائی تصور کی ہے،اس لیے ان کی ہر تحریک کا رشتہ علماء ہی سے جا کر جڑتا ہے۔

1806ء میں حالانکہ دہلی میں علامتی طور پر مغلیہ بادشاہت کا ایک بے جان ڈھانچہ موجود تھا، پھر بھی شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیا تھا، یہ گویا بالواسطہ انگریزوں کے خلاف جنگ کی ترغیب ہی تھی،شاہ عبدالعزیزؒ اپنی ذات سے ایک انجمن اور دلی میں طالبان علوم اسلامی کا مرجع و ماویٰ تھے،شاہ محمد اسحاقؒ آپ کے خلف ارشد تھے،شاہ محمد اسحاقؒ نے 1844ء میں مکہ مکرمہ ہجرت کی، آپ کے ہجرت کرنے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے آپ کی تمام املاک ضبط کر لیں،اس ضبطیٔ جائداد سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بھی کوئی اندرونی تحریک علماء کی انگریزوں کے خلاف چل رہی تھی اور خفیہ طور پر اپنا کام کر رہی تھی۔

شاہ عبدالعزیزؒ ہی نے سید احمد شہیدؒ کو نواب امیر علی خاں کی فوج میں عسکری تربیت کے لیے 1810ء میں روانہ کیا تھا، جب نواب نے انگریزوں سے معاہدہ کر لیا تو سید صاحبؒ واپس آ گئے، پھر سید احمد شہید کی تحریک شروع ہوئی ، یہ تحریک بظاہر رنجیت سنگھ والیٔ پنجاب کے ظلم و بربریت کے خلاف نظر آتی ہے؛لیکن در حقیقت یہ سید صاحب کا پہلا ہدف تھا،اصل ہدف انگریز ہی تھے اور غالباً سید صاحب کا خیال تھا کہ رنجیت سنگھ کو شکست دینے کے بعد سرحد کا علاقہ وہ موزوں تر علاقہ ہوسکتا ہے، جہاں سے انگریزوں پر وار کرنا مناسب ہوگا، اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ جب سید صاحب نے سرحد کی طرف اپنے جاں نثاروں کے ساتھ کوچ کیا،تو گوالیار بھی

(۱)انقلاب 1857ء

تشریف لے گئے، جہاں مہاراجہ گوالیار نے آپ کا پرتپاک استقبال کیا اور اعزاز واکرام کے ساتھ واپس کیا، آپ نے سرحد سے مہاراجہ گوالیار اور اس کے معتمد خاص غلام حیدر کو خط لکھا اور اس میں انگریزوں کی مخالفت کی ترغیب دی، آپ کے خط کا پہلا فقرہ ہی اس طرح ہے:

بیگانگان بعید الوطن ملاک زمین و زماں
گردیدہ وتاجران متاع فروش بہ پایۂ سلطنت (۱)

آپ نے اپنے خط میں یہ بھی یقین دہانی کرائی کہ جب ملک بیگانے دشمنوں سے خالی ہوجائے گا تو سیادت وریاست ارباب حکومت کو مبارک ہو، مجھے اس سے کوئی غرض نہ ہوگی، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب کے ذہن میں انگریزوں کے خلاف جہاد کا تصور موجود تھا، گو آپ رنجیت سنگھ سے نمٹنے کو اس وقت زیادہ بڑی ضرورت تصور کرتے تھے؛ اس لیے معرکۂ بالاکوٹ کے بعد ہمیں کلکتہ سے دہلی تک ہر جگہ انگریزوں کے خلاف علم بغاوت سید صاحب کے خلفاء ومتوسلین کے ہاتھوں میں نظر آتا ہے، خود دکن میں 1838ء میں اسی حلقہ کے مولانا ولایت علی اور مولانا سلیم تشریف لائے اور نظام دکن کے بھائی مبارز الدولہ نے ایک طاقتور خفیہ تنظیم قائم کی، جو تختۂ حکومت پلٹنا چاہتی تھی، بالآخر 1839ء میں مبارز الدولہ کی اس تحریک کا برطانوی ریزیڈنٹ نے پتہ چلایا، قلعۂ گولکنڈہ میں قید کئے گئے اور 1851ء میں راہی بہ بقاء ہوئے۔(۲)

1857ء کی تحریک آزادی میں جب جانبازان حریت میرٹھ سے دہلی آئے اور ۱۱رجون 1857ء کو علماء سے اس جنگ کی بابت استفسار کیا تو جن علماء نے فتویٔ جہاد پر دستخط کیا، ان میں اکثر وہی علماء تھے، جو شاہ ولی اللہ صاحب کے حلقہ سے تعلق رکھتے تھے، اس سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ 1857ء سے پہلے ہی سے علماء انگریزوں کے خلاف مہم جوئی اور منصوبہ بندی میں مصروف تھے، ہندوستان کی آزادی کی باضابطہ لڑائی مئی 1857ء میں شروع ہوتی ہے، جب انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں کی پہلی مہم ناکامی سے دوچار ہوئی ہے، اس ناکامی کے بعد ایک ایسی قیامت آئی کہ پوری جنگ آزادی میں اس کی مثال نہیں ملتی، مغرب کے علمبرداران تہذیب اور مصلحین درس انسانیت نے دہلی میں برسر راہ جگہ جگہ پھانسی کے پھندے نصب کر دیئے، جو شبانہ روز ہندوستانیوں کے سر سے آراستہ کئے جاتے، میرٹھ سے دہلی تک سینکڑوں درخت تھے، جو تختۂ دار کا کام کرتے تھے، معززین ورؤسا کو توپ کے دہانے پر باندھ دیا جاتا، توپ داغی جاتی اور کاغذ کے ٹکڑوں کی طرح گوشت کی

(۱) نقوش حیات: ۲/ ۱۳، علماء ہند کا شاندار ماضی، ص: ۱۷۴ (۲) انقلاب 1857: ۱/ ۱۰۸

بوٹیاں بکھر جاتیں، ان شہداء میں علماء سینکڑوں کی تعداد میں تھے، جن میں بہتوں کے نام تاریخ میں محفوظ ہیں اور ان سے زیادہ وہ ہیں، جو تاریخ کے دفینوں میں ہیں۔

جب یہ آتش انتقام کچھ ٹھنڈی ہوئی اور ہندوستانیوں کو سانس لینے کا موقع ملا تو پھر جذبۂ آزادی نے انگڑائی لی، اس وقت ملک کے طول وعرض میں ایک سناٹا اور سکوت تھا، صرف سید احمد شہید کی جماعت کے بچے کھچے لوگ تھے، جن کے سینے اب بھی جذبۂ جہاد سے معمور تھے، یہ حضرات زیادہ تر پٹنہ کے محلہ 'صادق پور' سے تعلق رکھتے تھے اور سرحد کی طرف انگریزوں اوران کے وفاداروں سے نبرد آزما تھے، مولانا ولایت علی صادق پوری نے ہزارہ میں ایک آزاد مملکت کی بنیا درکھ دی تھی، مولانا ولایت علی، مولانا عنایت علی اور مولانا محمد جعفر تھانیسری وغیرہ اس مہم میں پیش پیش تھے، چنانچہ انگریزوں کے خلاف ''انبالہ سازش کیس 1863ء'' میں مولانا یحییٰ علی عظیم آبادی اور مولانا محمد جعفر تھانیسری کے لیے سزائے موت اور مولانا عبدالرحیم عظیم آبادی کے لیے ''حبس دوام بہ عبور دریائے شور'' کا فیصلہ ہوااوران سبھوں کی جائداد بھی ضبط ہوگئی، بعد کو مولانا محمد یحییٰ اور مولانا محمد جعفر کی سزا بھی ''حبس دوام'' سے تبدیل ہوگئی، اس کے بعد اس تحریک کی باگ ڈور مولانا احمد اللہ عظیم آبادی نے اپنے ہاتھوں میں لی، ان پر بھی مقدمہ چلایا گیا اور فروری 1865ء میں ان کے لیے ''پھانسی مع ضبطیَ جائداد'' کا فیصلہ ہوا، مگر بعد کو ان کی سزائے موت بھی عمر قید میں تبدیل ہوگئی اور جون 1865ء کو کالا پانی بھیج دیئے گئے، مولانا ولایت علی کے ایک خلیفہ مولانا عبدالرحیم لکھنوی نے مالدہ ضلع کے ایک گاؤں میں جہاد کی ترغیب کا ایک مرکز قائم کیا، وہ یہاں سے سرحد اور پٹنہ کو امداد بھی بھیجا کرتے تھے، وہ بھی گرفتار کر لئے گئے، اس کے بعد ان کے صاحبزادہ مولانا امیر الدین نے یہ ذمہ داری سنبھالی، ان کے خلاف بھی ''حبس دوام مع ضبطیَ جائداد'' کا فیصلہ ہوااور مارچ 1872ء میں وہ کالا پانی بھیج دیئے گئے۔

عظیم آباد ہی میں دوسرا مقدمۂ بغاوت 1871ء میں قائم ہوا، اس مقدمہ کے ملزمین میں مولانا مبارک علی اور مولانا تبارک علی تھے، مولانا تبارک علی پر انگریزوں کے خلاف جنگ میں حصہ لینے اور ایک کمان کی سالاری کا الزام تھا، دونوں کے خلاف حبس دوام مع ضبطیَ جائداد کا فیصلہ ہوا، مولانا مبارک علی کا تو پہلے ہی انتقال ہوگیا اور مولانا تبارک علی کالا پانی بھیج دیئے گئے —— اسی دور کے مجاہدین آزادی میں مفتی عنایت احمد کاکوروی اور مفتی صدرالدین آزردہ تھے، جو بڑے پایہ کے علماء میں تھے، عربی گرامر پر مشہور کتاب ''علم الصیغہ'' مولانا نے جزیرۂ انڈمان میں اسارت کے دوران ہی تالیف فرمائی تھی، معروف محدث مولانا رشید احمد

گنگوہی بھی چھ ماہ جیل میں رہے، مولانا فضل حق خیر آبادی جو اپنے وقت کے امام المعقولات تھے، فتویٰ جہاد کے جرم میں 1859ء میں گرفتار کئے گئے، مقدمہ چلا، جج آپ کے علمی مقام سے واقف تھا اور چاہتا تھا کہ آپ اس فتوی سے انکار کر جائیں؛ لیکن مولانا اس کے لیے آمادہ نہیں ہوئے، آخر سزا ہوئی اور کالا پانی بھیجے گئے، ان سے غلاظتوں کے اٹھانے کا کام لیا جاتا، وہیں پیوند خاک ہوئے، نواب مصطفی خاں شیفتہ کی شہرت ایک شاعر کی حیثیت سے ہے، مگر اصل میں وہ بلند پایہ عالم بھی تھے، اور شیخ عبداللہ سراج حنفی مکی اور شیخ محمد عابد سندھی جیسے اہل علم سے شرف تلمذ رکھتے تھے، یہ بھی سات سال قید فرنگ میں رہے، اسی خونچکاں دور میں دہلی سے مسلمانوں کی ایک جمعیت جمنا پار لے جائی گئی اور انہیں لائن میں کھڑا کر کے گولی سے اڑا دیا گیا، ان شہداء حریت میں مولانا فضل حق خیر آبادی کے رفیق مولانا امام بخش صہبائی بھی تھے۔

مولانا رضی اللہ بدایونی عربی وفارسی کے بڑے ماہر شمار کئے جاتے تھے، گرفتار ہوئے اور خود عدالت میں اپنے جرم کا اقرار کیا، انگریز کلکٹر خود بھی چاہتا تھا کہ مولوی صاحب جرم سے انکار کر دیں، مگر فرمانے لگے کہ میں تمہاری وجہ سے ایمان اور آخرت خراب کرلوں؟ اس کے بعد گولی سے اڑا دیئے گئے، اسی دور میں مولانا محمد حسین (رائے بریلی)، مولانا ریاض الحق (بنگال)، مولوی علاء الدین (حیدرآباد) اور مولوی علاء الدین (پٹنہ) بھی نذر زنداں ہوئے، آخر الذکر نے تختۂ دار کو زینت بخشی اور باقی نے کالے پانی ہی میں جان جاں آفریں کے سپرد کر دی، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے شاملی میں انگریزی فوج پر حملہ کیا اور وارنٹ کے باوجود گرفتار نہ ہو سکے، شیخ المشائخ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی پر بھی وارنٹ تھا؛ لیکن مکہ ہجرت کر گئے، یہی حال مشہور عالم مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا ہوا۔

اس طرح انیسویں صدی کے وسط سے اس کے مکمل ہونے تک حقیقت یہ ہے کہ جنگ آزادی کی رکاب مسلمان علماء ہی کے ہاتھوں رہی، اور انہی کے خون ولہو سے اس مہم میں حرارت وگرمی پیدا ہوتی رہی، اس دور میں اس کا بنیادی مرکز ''سرحد'' کا علاقہ اور صادق پور (پٹنہ) رہا، یہ آزادی کا سب سے خونچکاں اور برطانوی بربریت ووحشت کے عروج کا دور رہا ہے، 1912ء میں مولانا حسرت موہانی نے انگریزی مال کے بائیکاٹ کے لیے پورے ملک میں تحریک چلائی، اس پر علماء کے فتاوی حاصل کئے، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی نے اس تحریک میں نہایت سرگرم حصہ لیا اور اس کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔

بیسویں صدی کے ایک دہے کے بعد یعنی 1915ء میں علماء کے زیر سایہ وہ عظیم الشان تحریک شروع

ہوئی جس کو''ریشمی رومال تحریک'' کہا جاتا ہے، اور جو بہ فیصلۂ تقدیر ناکام ہوگئی، اس کے ذریعہ کابل کی طرف سے ہندوستان پر حملہ اور ملک میں بہ یک وقت چہار طرفہ بغاوت کا منصوبہ تھا، اسی دور میں جلاوطن حکومت قائم ہوئی، جس کے صدر راجہ مہندر پرتاب تھے، مولانا برکت اللہ وزیر اعظم، مولانا عبید اللہ سندھی وزیر داخلہ اور مولانا بشیر وزیر دفاع تھے، کابل میں خدائی فوج قائم ہوئی، جس میں مولانا سیف الرحمن اور مولانا منصور انصاری وغیرہ شامل تھے، اس تحریک کے سرخیل اور دل ودماغ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی تھے، ''ریشمی رومال تحریک'' کے افشاء کے بعد مولانا موصوف حجاز سے گرفتار ہوئے اور مالٹا میں پانچ سال اسیر رہے، اس دور میں دارالعلوم دیوبند نے قیادت وسیادت کا کردار انجام دیا اور اس کے درجنوں فرزندوں نے آزادی کی اس تحریک میں روح پھونک دی، مولانا عزیز گل پشاوری، مولانا آزاد سبحانی، مولانا احمد اللہ پانی پتی، مولانا فضل ربی پشاوری، مولانا محمد احمد چکوالی، مولانا محمد مبین دیوبندی، مرحوم محمد ابراہیم راندمیری وغیرہ مجاہدین آزادی اسی مرکز علم ودین سے تعلق رکھتے تھے، اس کے علاوہ ریشمی رومال تحریک میں مولانا احمد علی لاہوری، مولانا سید ہادی حسن، مولانا ظہور محمد خاں، مولانا غلام محمد دین پوری، مولانا ابوالحسن تاج محمود (سکھر)، مولانا محمد صادق اور مولانا جلیل احمد کیرانوی وغیرہ اس زمانہ کے مشاہیر مجاہدین آزدای میں تھے، جن کے نام تک سے آج نئی نسل کے کان ناآشنا ہیں۔

ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں ایک اہم کردار ''خلافت تحریک'' کا بھی ہے، جس نے ملک کو شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک انگریزوں کے خلاف ''بنیان مرصوص'' بنادیا تھا اور ہندو مسلم اتحاد کی لہر پیدا کردی تھی، یہ تحریک گو 1920ء میں شروع ہوئی اور 1942ء میں ختم ہوگئی، لیکن اس نے ہندوستانیوں کے دل سے حکمرانوں کی ہیبت اور فرمانرواؤں کا خوف نکال کر رکھ دیا اور نیا عزم وحوصلہ اور نئی ہمت وامنگ عطا کی، خود گاندھی جی کو اعتراف تھا کہ خلافت ہی کی تحریک ہے، جس نے قوم کو بیداری عطا کی ہے، اس تحریک کے اصل مؤسس علماء ہی تھے، جن میں مفتی کفایت اللہ دہلوی کا نام سرفہرست ہے، جمعیۃ علماء ہند کی بنیاد ہی خاص اس لیے پڑی کہ وہ مسلمانوں کو شمع آزادی کا پروانہ بنائے رکھے، اور اس مقصد کے لیے جینا مرنا سکھائے، جمعیۃ علماء کے اولین محرک مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد تھے، جو شیخ الہند مولانا محمود حسن سے بڑا تعلق رکھتے تھے، اور مولانا ابوالکلام آزاد اہم امور پر ان سے مشورہ لیا کرتے تھے، مولانا نے سب سے پہلے بہار میں انجمن علماء بہار قائم کی اور خلافت کمیٹی کے پہلے اجلاس منعقدہ بمبئی 1920ء میں جمعیۃ کے قیام کی تحریک کی۔

1920ء میں حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد نے ترک موالات سے متعلق فتویٰ مرتب کیا، جس پر وقت کے پانچ سو ممتاز علماء نے اپنی تصدیقی دستخط ثبت کئے، ان میں جہاں ایک طرف دیوبند کے مفتی کفایت اللہؒ اور مولانا احمد سعید کے دستخط تھے، وہیں ندوہ سے علامہ سید سلیمان ندوی کے، اور غیر مقلد حضرات کی طرف سے مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا عبدالحکیم گیاوی مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی اور مولانا داؤد غزنوی نے اس فتویٰ کی تائید کی، وہیں بریلوی مکتبۂ فکر سے مولانا فاخرالہ آبادی اور مولانا عبدالماجد بدایونی نے حق نمائندگی ادا کیا۔

''تحریک ترکِ موالات'' ہی کے موقع سے علامہ شبلی نے وہ مشہور نظم کہی، جس میں انگریزوں کو چیلنج بھی تھا اور ہندوستان کے حال زار پر غم اور افسوس کا اظہار بھی کہ:

کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو!
یہ ظلم آرائیاں تاکے؟ یہ حشر انگیزیاں کب تک؟
کہاں تک لوگے ہم سے انتقامِ فتح ایوبی؟
دکھاؤ گے ہمیں جنگ صلیبی کا نشاں کب تک؟

گاندھی جی کی تحریک نمک سازی (نمک ستیہ گرہ) اور کھدر پوشی کو بھی علماء نے مذہبی رنگ عطا کیا اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے لاہور کے اجتماع میں 1931ء میں اس حدیث سے اس پر استدلال کیا، جس میں گھاس نمک اور پانی کو مباح الاصل قرار دیا گیا ہے۔

1946ء میں جو ''ہندوستان چھوڑ وتحریک'' (Quit India Movement) شروع ہوئی، کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اس کے اصل محرک مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ تھے، ان ہی کی تجویز پر کانگریس اور جمعیۃ العلماء نے اس تجویز کو منظور کیا، جس کے نتیجہ میں مولانا گرفتار ہوئے اور بہت کچھ ابتلاؤں سے گزرے، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مکمل آزادی کا نام پہلی دفعہ مولانا محمد علی جوہر ہی کی زبان پر آیا، مولانا نے گول میز کانفرنس لندن میں پوری قوت اور مجاہدانہ جوش کے ساتھ فرمایا:

''میں غلام ہندوستان میں واپس نہیں جاؤں گا، میں یہاں سے اس وقت لوٹوں گا، جب میرے ہاتھ میں ہندوستان کی آزادی کا پروانہ ہوگا، تم مجھے آزادی کا پروانہ نہیں دے سکتے تو میرے لیے اس سرزمین میں ایک قبر کی جگہ تو دینی ہی پڑے گی۔''

یہ حقیقت بھی آج کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ 'کانگریس پارٹی' جس کو جنگ آزادی کا ہیرو سمجھا جاتا ہے، اس کی تاسیس اس جنگ آزادی کے لیے عمل میں نہیں آئی تھی؛ بلکہ خود ایک انگریز کی ایماء پر 7/دسمبر 1884ء کو تھیوسافیکل سوسائٹی کے اجلاس پونا میں کانگریس کے قیام کی تجویز منظور ہوئی، جسے وائسرائے ہند نے منظوری دی اور دسمبر 1885ء میں اس کا پہلا اجلاس منعقد ہوا، اور اس میں جو اہم ترین تجویز منظور ہوئی، وہ یہ تھی کہ ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان اتحاد اور یگانگت پیدا کی جائے۔

تحریک آزادی کے آخری دور میں جن لوگوں نے قوم وملک کی قیادت کی ہے اور جذبۂ حریت کی شرر کو شعلہ وآتش بنایا ہے، ان میں حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا محمد میاں، مولانا منت اللہ رحمانی، مولانا عبدالصمد رحمانی، مولانا سید فخر الدین احمد، رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا عبدالحکیم صدیقی، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا مرتضی حسن چاند پوری، مولانا محمد اللہ غزنوی اور مولانا ثناء اللہ امرتسری کے نام آب زر سے لکھنے کے لائق ہیں، اور اس عہد کی ''جمعیۃ علماء ہند'' کو بھی یاد رکھا جائے گا، جس نے کانگریس کے دوش بدوش اور قدم بہ قدم اس جدو جہد میں حصہ لیا، اور ملک وقوم سے وفاداری کا حق نام ادا کیا۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ کو انگریزوں سے ایسی نفرت تھی کہ فرماتے تھے:

''انگریزوں سے جنگ کرنا جزو ایمان ہے، میں اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھ سکتا، جب تک انگریز یہاں سے چلا نہ جائے۔''

مولانا حسین احمد مدنیؒ فرمایا کرتے تھے:

''میرا بس ایک ہی دشمن ہے اور وہ ہے انگریز، اگر کوئی کتا بھی کسی انگریز بہادر کو کاٹ کھائے یا اس پر بھونک دے، تو مجھے اس لیے خوشی ہوگی کہ اس کا اور میرا مشن ایک ہے، میں مسلمانوں کے ساتھ دوسرے مذہب کے پریمیوں کو بھی تلقین کرتا ہوں کہ اس ملک میں مذہب کی خیر صرف اس صورت میں ہے کہ انگریزوں کو ہم نکال باہر کریں۔''

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی انگریزوں سے نفرت کا حال یہ تھا کہ کہا کرتے تھے:

''میں تو اس چیونٹی کو بھی شکر کھلاؤں گا، جو کسی صاحب بہادر انگریز کو ڈس لے،

انگریز دشمنی میری سانس کے ساتھ ہے، دین کے دیگر فرائض کی طرح انگریز
سے جنگ کرنا ایمان اوران کی فوجی طاقتوں سے ڈرنا کفر ہے۔''

اب اخیر میں اس تحریک آزادی کے گل سر سبد مولانا ابوالکلام آزاد کا ذکر کرنا چاہوں گا، جس نے زندگی کے اکثر حصے قید واسارت کی دیواروں میں بسر کئے، رفیقۂ حیات کے جنازہ میں شرکت سے بھی محروم رہا، اور جس نے ''الہلال والبلاغ'' کے ذریعہ ہندوستان کے تن مردہ میں ایک نئی روح پھونک دی اورنئی زندگی پیدا کی، جس کی رات کی کروٹیں اس مقصد کے لیے بے سکون تھیں اور جس کی نم آنکھیں ہر صبح وشام آزادیٔ وطن کے ترانے گاتی تھیں اور دلوں کے ساز کو چھیڑتی تھیں، اور کانگریس کے اونچے لیڈروں میں جس نے سب سے آخر آخر کراہتِ خاطر کے ساتھ ملک کی تقسیم کو گوارا کیا تھا، ڈاکٹر تاراچند مولانا آزاد کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس مقصد کے لیے انہوں نے اپنا سب کچھ قربان کردیا، اپنی پوری قوت، اپنی
بے مثال خطابت، اپنے متوازن نظریئے، اپنے عاقلانہ مشورے، اپنی وسیع
النظر حب الوطنی، اپنا ابلتا ہوا جوش، اپنا احساس برتری، اپنی مقصدیت، یہ سب
انہوں نے ہندوستان کی آزادی کی بھینٹ چڑھادیا۔''

حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر تاراچند کا یہ اعتراف ایک ایسی حقیقت کا اعتراف ہے، جو مہرنیم روز سے بھی زیادہ روشن اورتابناک ہے!

اور ہندوستان کی تاریخ آزادی ہمیشہ اس مردمجاہد کو بھی یادرکھے گی، جس نے آزادی کی اس جدوجہد میں بھرپور شرکت کی اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کے آخری اجلاس میں بھی، جو چھ سوارکان پر مشتمل تھی، تقسیم ملک کی تجویز کی شدت سے مخالفت کی؛ لیکن ایک آواز بھی اس کی تائید میں نہ اٹھ سکی، میری مراد مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ سے ہے، افسوس کہ ان شہداء قوم اور جاں نثارانِ ارض وطن کا نام تک آج زبان پر نہیں آتا؛ لیکن یہ سعید روحیں آج کے ہندوستان سے ضرور کہتی ہوں گی کہ:

تیرے نکھرے عارضوں میں، تیرے سنورے گیسوؤں میں
میری صبح کی چمک ہے، میرے شام کی سیاہی
تجھے گر یقیں نہ آئے تو میں آئینہ دکھا دوں
تیرا حسن دے رہا ہے میرے عشق کی گواہی

سلامتی ہو ان مجاہدین آزادی پر، ان کی روحوں پر، ان کی خواب گاہوں پر کہ ان کی شہادت کے خون ولہو کی سرخی نے آج ان کے وطن کو لالہ زار بنا دیا ہے، غلامی کی زنجیریں کٹ چکی ہیں، غیر ملکی بادشاہت کے آہنی لباس تار تار ہو چکے ہیں، ان میں کچھ نے اپنی آنکھوں کو اس آزادی سے ٹھنڈا کیا ہے، کچھ حسرتوں کے ساتھ خدا کے ہاں پہلے ہی چلے گئے، کچھ کے نام تاریخ کے صفحات نے یاد رکھے ہیں اور کتنے ہی ہیں کہ خدا کے سوا ان کی قربانیوں، فداکاریوں اور جانبازیوں کو کوئی نہیں جانتا۔

فرزندانِ وطن کا فرض ہے کہ آزادی کے اس چراغ کو روشن رکھنے کی کوشش کریں، ہم ذات پات، مذہب و برادری اور زبان کی سطح سے اوپر اٹھ کر ایک سچے اور ایماندار ہندوستانی ہونے کا ثبوت دیں، یہاں اقلیتیں خود کو محفوظ باور کریں، اکثریت اور اقلیت کے لیے انصاف کا ایک ہی پیمانہ ہو، وہ مزدور کہ بلند و بالا عمارتیں، سرسبز وشاداب باغات، خوبصورت نہریں اور صاف وشفاف سڑکیں سب انہیں کے پسینوں کی رہین منت ہیں، ان کو ان کا حق ملے، اور ہر گھر میں مسرت وخوشحالی اور انصاف کا چراغ جل سکے، وہ آزادی جو دلوں کو سکون دے، جو امتیاز وتفریق کی دیواروں کو ڈھا دے، جو بلند و بالا عمارت میں رہنے والوں میں بھی غریبوں کی جھونپڑیوں سے محبت پیدا کر دے، جہاں مذہب نفرت کی بنیاد نہ ہو؛ بلکہ مختلف مذاہب کی رنگارنگی اس کو گلدستہ کا مصداق بنا دے کہ:

گل ہائے رنگارنگ سے ہے زینتِ چمن

○○○

چند نامور مسلم مجاہدین آزادی

مولانا محمد انظر قاسمی ❖

ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ کا اگر غیر جانبداری سے جائزہ لیا جائے تو اس حقیقت کا اعتراف لازم ہوگا کہ مجاہدین آزادی کی صفوں میں ہندوستان کے مسلمان سب سے آگے تھے، ممتاز صحافی و ادیب آنجہانی خشونت سنگھ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> The famous writer Khushwant Singh, once wrote: "Indian Freedom is written in Muslim blood, since their participation in the freedom struggle was much more, in proportion to their small percentage of the population".
>
> ہندوستان کی آزادی کی کہانی اور تاریخ مسلمانوں کے خون سے لکھی گئی ہے۔ آبادی کے لحاظ سے کم تناسب کے باوجود جدوجہد آزادی میں مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد نے نہ صرف بڑھ چڑھ کر حصہ لیا بلکہ اپنے وطن عزیز کی آزادی کو یقینی بنانے اپنی جانوں کے نذرانے بھی پیش کئے۔

انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا کے مطابق کم وبیش 95000 / ہزار لوگوں نے وطن عزیز کو آزاد کرانے کے لئے اپنی جانوں کی قربانیاں پیش کیں جن میں سے تقریبا 61000 / ہزار مسلمان، 14000 / ہزار او بی سی، 8000 / ہزار سکھ اور 5000 سے 6000 / ہزار اعلیٰ ذات کے ہندوں ہیں، لیکن موجودہ وقت میں حب الوطنی کی سند تقسیم کرنے والی جماعت کے ایک فرد کا بھی ذکر نہیں ملتا ہے۔

اس ملک کو آزاد کرانے میں مسلمانوں نے جان و مال کی جو قربانیاں پیش کی ہیں ان تمام مجاہدین کا احاطہ تو مشکل ہے لیکن 1857 / اور اس کے بعد کے چند مجاہدین کا یہاں ذکر کیا جارہا ہے۔

❖ استاذ شعبہ انگریزی: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

1858 کے بعد جب سارے برادران وطن ایک سطح پر آ گئے اور انگریز ہندوستان پر مسلط ہو چکا، اس وقت کیا ماحول تھا؟ اُسے جانے بغیر مجاہدین آزادی کی خدمات اور قربانیوں کی اہمیت اور قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں کیا جاسکتا، اس لئے تھوڑی دیرہ کے لئے ہم آپ کو اسی فضا اور ماحول میں لے چلتے ہیں۔

11 / مئی 1857ء، جب انگریزی فوج کے سپاہیوں نے حکومت کے خلاف بغاوت کی اور اپنے انگریز افسروں کو گولی مار کر دہلی پر قبضہ کرنے کیلئے چلے، لیکن یہ تحریک کامیاب نہ ہوسکی تحریک کی ناکامی کے بعد انگریزوں نے انتقامی کارروائیوں کا آغاز کیا اور اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کو خاص طور پر کچل دیا گیا، دہلی کا چاندنی چوک ہی نہیں بلکہ شہر کے ہر چوراہے پر سولیاں نصب کر دی گئیں، دہلی اور دہلی کے باہر درختوں کی شاخوں سے پھانسی کے پھندے لٹک رہے تھے، جو بھی معزز مسلمان انگریزوں کے ہاتھ چڑھ گیا، اسے ہاتھی پر بٹھایا، درخت کے نیچے لے گئے، پھندا اس کی گردن میں ڈال کر ہاتھی کو آگے بڑھا دیا، لاش پھندے میں جھول گئی، آنکھیں ابل پڑیں، زبان منہ سے باہر نکل آئی، ذبح کئے ہوئے مرغ کی طرح جانکنی کا وہ ہیبتناک منظر کہ الامان والحفیظ، ایک انگریز عورت نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ بسا اوقات ان پھانسیوں پر لٹکائے جانے والوں کی لاشیں تڑپ تڑپ کر انگریزی ہندسے کا 8 بن جاتی تھیں۔

مسلمانوں میں خوف و ہراس اور دہشت پھیلانے کیلئے وہ سزا کے نت نئے طریقے ایجاد کرتے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ کسی سربرآوردہ مسلمان کو پکڑ کر توپ کے دہانے پر رسیوں سے جکڑ کر باندھ دیا اور توپ داغ دی، پھر کیا ہوتا تھا؟ اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے زبان لرز رہی ہے اور اس کربناک صورت حال کے اظہار سے قاصر ہے، پورے جسم کا گوشت بوٹی بوٹی ہو کر فضا میں اڑ جاتا تھا، جس طرح تیز ہوا میں کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے، دور تک خون کے چھینٹے اس طرح پڑتے تھے جیسے فضا سے زمین پر کسی نے خون کا چھڑکاؤ کیا ہے، لاش کا سر فضا میں میلوں بلندی پر جا کہ جب زمین پر گرتا تھا تو بسا اوقات کسی راہ گیر یا جانور کی جان چلی جاتی تھی۔

یہ تھا وہ روح فرسا اور دل دہلا دینے والا ماحول ہر طرف دارو گیر کا حشر برپا تھا۔ علی الاعلان مسلمان پھانسیوں پر چڑھائے جارہے تھے، گرفتاریوں کا سلسلہ جاری تھا۔ انگریز اب عدالت کی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ مگر یہ کرسی عدل وانصاف کے لئے نہیں تھی بلکہ وہ اپنے واحد دشمن مسلمانوں کے دماغ سے حکومت واقتدار کی بو باس کو ختم کرنے کیلئے اس کو استعمال کرتا تھا اور عدل وانصاف کا ڈرامہ کیا جاتا تھا، مقدمات چلائے جاتے تھے فرضی گواہ

اور شہادتیں پیش کی جاتی تھیں اور فیصلہ سنا دیا جاتا تھا کہ اس کو تختہ دار پر چڑھا دو یا ان کی نگاہ میں اس مسلمان کا جرم اور بڑھا ہوا ہے تو اس کو کالے پانی کی سزا دی جاتی تھی، کیونکہ حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا پھانسی کی سزا سے کہیں زیادہ اذیت رساں تھی، انگریز مخصوص مسلمانوں کو ہی سزا دینے میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔

کالے پانی بھیجے کا مطلب یہ تھا کہ مجرم اپنے وطن اپنے گھر اپنے دوست احباب، عزیز و اقارب اپنے خاندان اور اپنے بیوی بچوں کیلئے زندہ رہتے ہوئے بھی مرجاتا تھا اور ایسی گھٹ گھٹ کر زندگی گزارنے پر مجبور ہوتا تھا کہ موت کو اس زندگی پر ترجیح دینے لگتا تھا ہندوستان کے مشاہیر علماء و مشائخ، روساء و امراء جن کی راہوں میں عوام آنکھیں بچھاتے تھے، جنکے اعزاز واحترام کا عالم یہ تھا کہ مسلمانوں میں انکو سر اور آنکھوں پر بٹھایا جاتا تھا، خوشحال گھرانوں کے افراد جن کی خدمت کیلئے ہمیشہ نوکروں کی لائن لگی رہتی تھیں ایسے معزز رؤساء علما و مشائخ کو جزیرہ انڈمان کالے پانی کی مسموم فضا میں بھیجا جاتا تھا جہاں ان سے ذلیل سے ذلیل کام کیا جاتا تھا یہ جزائر درحقیقت بڑے بڑے قید خانے تھے جس میں چہار دیواریاں اور فصیلیں تو نہیں تھیں لیکن چاروں طرف حد نگاہ تک سمندر لہریں مارتا رہتا تھا، ان جزیروں میں ان معزز و محترم شخصیتوں سے لکڑیاں کٹوائی جاتی تھیں، سڑکیں بنوائی جاتی تھیں نالیاں اور گندگیاں صاف کرائی جاتی تھیں کوڑے کرکٹ کی ٹوکڑیاں ان پر لاد کر پھنکوائی جاتی تھیں۔

مولانا فضل حق خیر آبادیؒ

علامہ فضل حق خیر آبادی 1797ء میں علامہ فضل امام فاروق خیر آبادی صدر الصدور دہلی کے گھر پیدا ہوئے۔ آپ نے اپنے والد فضل امام اور حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی و حضرت عبدالعزیز محدث دہلوی سے تعلیم و تربیت حاصل کی۔

1809ء میں جب آپ کی عمر تیرہ سال کی تھی اس وقت تک تمام علوم نقلیہ اور عقلیہ کی تکمیل کر لی۔ ایک مدت تک درس وتدریس میں مصروف رہے۔

آپ منطق وفلسفے کے امام تھے، بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، انگریزوں کے خلاف فتوی دیا تھا اور ان سے جہاد کو فرض کہا تھا اس جرم میں 1859 میں سیتا پور سے گرفتار کر کے لکھنو لائے گئے مقدمہ چلا، سرکاری وکیل کے مقابل مولانا خود بحث کرتے تھے، جج مولانا کی عظمت اور تبحر علمی سے واقف تھا وہ کسی وجہ سے چاہتا تھا کہ مولانا کو رہا کر دیا جائے لیکن بحث کے تیسرے دن مولانا نے عدالت سے کہا کہ جس مخبر نے فتوی کی خبر دی

اب میں اس کی توثیق کرتا ہوں اس گواہ نے سچ رپورٹ لکھوائی تھی اب عدالت میں میری صورت سے مرعوب ہوکر جھوٹ بولا ہے، میں اقرار کرتا ہوں کہ فتویٰ میرا لکھا ہوا ہے اور میرے ہی مشورے سے علماء نے دستخط کئے ہیں، مجھے خدا کے حضور جانا ہے، غلط بات مذہب کے معاملہ میں، میں نہیں بول سکتا۔ اس اقرار کے بعد اس کے سوا اور کوئی دوسری سزا ہو ہی نہیں سکتی کہ مولانا کو حبس دوام بہ عبور دریا کے شور کی سزا دیجائے، چنانچہ عدالت نے فیصلہ سنادیا مولانا نے بڑی خوشی سے فیصلہ سنا اور منظور کیا اور پھر مولانا کو انڈمان روانہ کردیا گیا۔

انڈمان میں مولانا کو خدمت بہت ذلیل سپرد کی گئی، آپ کے ذمہ قیدیوں کے بارکوں کی صفائی تھی۔ کہاں ہندوستان کا علامہ زماں، اور علمی دنیا کا بے تاج بادشاہ اور کہاں کوڑا کرکٹ کی ٹوکری؟ مولانا جس جیل میں تھے اس کا سپرنٹنڈنٹ ایک انگریز تھا۔ اس نے فین ہیئت میں ایک کتاب فارسی زبان میں لکھی تھی ایک قیدی جو مولوی تھے انگریز نے انکو دی کہ اس کی تصحیح کردیں لیکن یہ انکے بس کی بات نہیں تھی، مولوی صاحب نے سپرنٹنڈنٹ سے کتاب لی اور سیدھے مولانا فضل حق کی خدمت میں پہونچے، مولانا نے ایک ہفتہ میں کتاب کو درست کر کے مفید اضافے کئے اور اس پر جگہ جگہ حاشیہ بھی لکھا، مولوی صاحب جو کتاب لیکر آئے تھے ان کے ذریعے سپرنٹنڈنٹ جیل کو بھیج دی، اس نے سمجھا مولوی صاحب نے یہ کام کیا ہے ان کی خوب تعریف کی تو مولوی صاحب نے کہا کہ حضور یہ میرا کارنامہ نہیں ہے بلکہ مولانا فضل حق کا ہے جو فتوی جہاد کے سلسلہ میں یہاں آئے ہوئے ہیں اسی وقت سپرنٹنڈنٹ مولوی صاحب کو لے کر مولانا کے ٹھکانے پر آیا، علامہ نہیں تھے وہ انتظار کرتا رہا دیکھا کہ ایک شخص ٹوکرا بغل میں دبا کے چلا آرہا ہے، مولوی صاحب نے کہا یہی مولانا فضل حق ہیں، یہ منظر دیکھ کر انگریز کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور مولانا سے معذرت کر کے اپنی پیشی میں لے لیا۔

علامہ کے صاحبزادے نے ولایت میں اپیل کر رکھی تھی اور افسران بالا سے تعلق رکھنے والوں نے سفارشیں کی تھیں جسکے نتیجہ میں مولانا کی رہائی کا پروانہ آ گیا، صاحبزادے مولوی شمس الحق رہائی کا پروانہ لیکر انڈمان گئے تاکہ والد صاحب کو اپنے ساتھ لائیں، جب جہاز سے جزیرے میں اترے اور شہر میں گئے تو ایک جنازہ نظر آیا، جنازہ کے ساتھ ہزاروں آدمیوں کی بھیڑ چل رہی ہے، اعلیٰ حکام جنازہ کے ساتھ چل رہے ہیں مولوی شمس الحق نے کسی سے پوچھا کہ یہ کون بزرگ ہیں؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ مولانا فضل حق خیرآبادی کا جنازہ ہے کل 12 صفر المظفر 1278 (اکتوبر 1861) کو انتقال ہوا ہے اب پیوند خاک کرنے کیلئے جنازہ جارہا ہے، مولوی شمس اپنے ہاتھوں باپ کو جزیرہ میں دفن کر کے تنہا وطن واپس لوٹ آئے۔

مولانا جعفر تھانیسری

مولانا جعفر تھانیسری ہریانہ کے قصبہ تھانیسر میں 1837 میں پیدا ہوئے دس سال کی عمر میں مولانا جعفر تھانیسری کے والد وفات پا گئے، تھانیسر میں بڑی خوشحالی کی زندگی گذار رہے تھے، بہت بڑی جائداد اپنی محنت سے پیدا کر لی تھی، جماعت مجاہدین میں انکا بڑا اعزاز تھا، رقوم اور مجاہدین انہیں کے ذریعہ سرحد بھیجے جاتے تھے۔

غدر 1857 کے بعد کئی برسوں تک اندرون ملک سیاسی جدوجہد کے میدانوں میں ایک گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔عوام حالات سے سمجھوتہ کرنے لگے تھے تاریک مستقبل کے تصور ادر برطانوی استبداد نے ہاتھ پاؤں کی طاقت سلب کر لی تھی برادران وطن انگریزی اسکولوں میں داخل ہوکر اپنے اور اپنے خاندان کے مستقبل کو سنوارنے میں لگ چکے تھے کیونکہ انگریزی حکومت کی عنایتوں اور کرم فرمائیوں کا دروازہ مسلمانوں کے علاوہ سب کے لئے کھلا ہوا تھا، اسکولوں اور کالجوں سے نکلتے ہی انکوسرکاری دفتروں میں ملازمت مل جایا کرتی تھی، اس کے برخلاف مسلمانوں کوانگریزی اقتدار سے اتنی نفرت تھی کہ انھوں نے ان کے قائم کردہ اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے کو بھی اپنی خودداری اور جذبہ آزادی کے خلاف تصور کیا، اس لئے بہت دنوں تک انھوں نے انگریزی تعلیم کی طرف نگاہ غلط انداز بھی نہیں ڈالی لیکن کچھ عرصہ بعد جب مسلمانوں کی ایک نسل انگریزی تعلیم حاصل کر کے نکلی تو اس پر بذریعہ حکم ملازمتوں کا دروازہ ہی بند کر دیا گیا تھا، اگر بڑی عنایت ہوئی تو کسی دفتر میں چٹھی رساں اور چپراسی بنا دیا گیا۔

ناامیدی اور مایوسی کے اسی مہیب سناٹے میں ہندوستان کے سرحدی علاقوں کی طرف سے مجاہدین آزادی کی تلواروں کی جھنکار رہ رہ کر سنائی دیتی تھی، یہ وہ لوگ تھے جو غدر 1857 سے پہلے سے ایک جابر حکومت کے خلاف نبرد آزما تھے لیکن 1857 کے فوراً بعد ان کا رخ اس سفید فام قوم کی طرف مڑ گیا جو ابھی ابھی اقتدار پر قابض ہوکر ہندوستان پر بے پناہ مظالم توڑنے لگی تھی۔ان مجاہدین آزادی کی سرگرمیوں کا آغاز سید احمد رائے بریلوی اور مولانا اسماعیل شہید کی قیادت میں ہوا تھا، لیکن ان حضرات کی شہادت کے بعد یہ طاقت بکھر نہیں گئی بلکہ اس کا نظام اور مستحکم ہوا اور وسیع بھی ہوا، اس کے خفیہ کارکن بنگال سے لے کر سرحد تک مسلسل رواں دواں رہتے تھے ۱۸۵۷ء سے پہلے بھی کئی بار برطانوی فوجوں سے ان کی ٹکر ہو چکی تھی لیکن اس تاریخ کے بعد تو صرف انگریزی حکومت ہی ان کے بالمقابل تھی، ان مجاہدین آزادی کی انگریزوں سے آخری جنگ امبیلہ میں ہوئی، اب مجاہدین آزادی کے اعلانات میں صاف طور پر انگریزی حکومت کا نام لیا جانے لگا تھا اور مسلمانوں کو

ان کے خلاف جوش وجذبہ دلایا جاتا تھا مگر یہ جنگ ایسے علاقے میں لڑی جاتی تھی کہ اندرون ملک اس کی اہمیت ونزاکت کا صحیح احساس نہیں ہوتا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ اس طرح کی جنگ کے لئے اندرون ملک کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی کیونکہ انگریزوں کا پنجہ استبداد پورے نظام پر اتنا مضبوط پیوست ہو چکا تھا کہ مجاہدین آزادی کی کہیں بھی مورچہ بندی ناممکن ہو چکی تھی، اسلئے مجاہدین آزادی نے ہندوستان کے سرحدی صوبے اور آزاد قبائل کو اپنی کمین گاہ بنایا اور اپنی فوجی چھاؤنیاں انھیں علاقوں میں قائم کیں اور وہیں سے انھوں نے انگریزی فوجوں کو کئی بار زبردست شکستیں دیں اور کبھی کبھی مجاہدین آزادی کے حملوں کا دباؤ اتنا بڑھ جاتا تھا کہ بڑی سے بڑی فوجیں اس کے دفاع میں لگانی پڑتی تھیں۔

انگریز مصنفین، مشاہدین اور تحقیقاتی رپورٹ مرتب کرنے والوں کے قول کے مطابق مجاہدین کی طاقت کو توڑنے کیلئے سولہ مہمیں بھیجنی پڑیں، جن میں ۲۳ ہزار باقاعدہ سپاہی تھے، یہ وہ تعداد ہے جو 1850 سے 1857 تک سرحدی علاقوں میں بھیجی گئی جو مجاہدین آزادی کا محاذ جنگ تھا۔ 1858 سے 1863 تک علیحدہ علیحدہ مہموں کی تعداد بیس تک پہونچ گئی، جن میں بے قاعدہ مددگاروں اور پولیس کے علاوہ ساٹھ ہزار باقاعدہ سپاہی تھے۔ آخر آخر میں ۲۰ راکتوبر کو ایک برطانوی فوج مجاہدین کی طاقت کو توڑنے کیلئے بھیجی گئی، انگریزی فوج کو علاقے میں پہونچ کر معلوم ہوا کہ قبائلی مجاہدین کے ساتھ مل گئے ہیں اور حکومت پنجاب کے نام تار پر تار آرہے ہیں کہ امداد اور مزید امداد فوراً بھیجی جائے، فیروز پور سیالکوٹ اور لاہور کے دستے فوراً روانہ کر دیئے گئے۔ دو ہفتے کے اندر پنجاب کی چھاونیاں خالی ہوگئیں، 11 نومبر 1863 کو مجاہدین نے حملہ کر دیا اور انگریزی فوج کو پسپا ہونا پڑا، چمبرلین خطرناک حد تک زخمی ہوا اور 847 انگریزی سپاہی مارے گئے۔ سرحدی علاقوں میں مجاہدین آزادی کی انگریزوں سے یہ جنگ مسلسل جاری رہی، انگریزی رپورٹوں کے مطابق ایک ایک مقابلہ میں کئی کئی سو مجاہدین شہید ہوتے رہے لیکن ان کے پائے استقامت میں کبھی جنبش نہیں ہوئی اور وہ ہمیشہ آگے بڑھتے رہے، آزادی کی یہ تحریک یا بغاوت کا جذبہ بنگال سے پشاور تک یکساں تھا 1800 سے 1870 تک تنہا مسلمان مجاہدین آزادی نے انگریزوں کے خلاف آزادی کی لڑائی کو جاری رکھا اور انقلاب کی رہنمائی کے فرائض انجام دیتے رہے، اس زمانے میں دوسرے برادران وطن انگریز دوستی کو حاصل زندگی سمجھتے رہے اور انگریزی تعلیم حاصل کر کے حکومت کی نوکری کو سرمایہ حیات تصور کرتے رہے، انہیں انقلاب یا آزادی کا ہلکا سا تصور بھی نہیں تھا؛ بلکہ اسکے برعکس ان کا اعلیٰ اور متوسط طبقہ جس میں کلکتہ بارکونسل کے ارکان اخبار نویس

اور دوسرے پیشوں کے لوگ تھے۔ نہ یہ کہ مسلمانوں کی اس انقلابی تحریک سے اپنے کو علیحدہ رکھا بلکہ آزادی کے دیوانے مسلمانوں پر انگریزی مظالم کی تائید کرتے رہے اور انگریزوں کی حمایت میں رزولیشن پاس کرتے رہے اور اخباروں میں اداریے لکھتے رہے۔

لیکن ۱۸/اکتوبر 1863 کی جنگ کے بعد حالات بدل گئے، تباہیوں اور بربادیوں نے گھر دیکھ لیا، حکومت کی طرف سے اندرون ملک بڑے پیمانے پر ان تمام مرکزوں پر چھاپے مارے گئے جہاں سے مجاہدین آزادی کو مدد ملتی تھی۔ مجاہدین کی فوج میں بھرتی اندرون ملک سے ہوتی تھی، رقوم اور رسد کا انتظام بھی یہیں سے ہوتا تھا، اسلحہ کی فراہمی اور خریداری کیلئے بھی اندرون ملک ہی سے بندوبست کیا جاتا تھا پھر اس کو خفیہ طور پر سرحد تک پہونچایا جاتا تھا، ان کا ایک بہت ہی خفیہ نظام تھا، انتہائی ایمانداری اور رازداری کے ساتھ رقمیں پہونچائی جاتی تھیں اور اسلحہ سرحدی علاقوں میں بھیجے جاتے تھے، پورے ملک میں بڑے پیمانے پر چھان بین شروع ہوئی پولیس، سی آئی ڈی اندرون ملک ایک ایک آدمی کو سونگھتی پھرتی تھی اور جہاں کوئی آدمی مشتبہ نظر آیا اس کو گرفتار کرلیا جاتا تھا، مجاہدین کے مرکزوں کا سراغ حکومت کو چار آدمیوں کی اتفاقی گرفتاری سے لگا مئی 1863 میں ضلع کرنال میں چار آدمی جاتے ہوئے پولیس والوں کو ملے جن کی شکل وصورت درویشوں کی تھی، ان کے چہروں پر چھوٹی چھوٹی ڈاڑھیاں تھیں، پولیس افسر (غزن خان) کو شبہ ہوا کہ ہونہ ہو یہ بنگالی ہیں اس نے گرفتار کرلیا، پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ ہم تھانیسر میں منشی محمد جعفر سے ملیں گے پھر آگے نکل جائیں گے، پولیس نے ان چاروں کو پانی پت تھانے میں پہونچادیا لیکن شہادت ناکافی ہونے کی وجہ سے بعد میں پولیس کو انھیں رہا کرنا پڑا، پولیس افسر کو ان کی رہائی پر سخت غصہ آیا اور اس نے مجاہدین آزادی کی جڑ بنیاد کھود دینے کا پلان بنایا اس نے اپنے لڑکے (فیروز خان) کو تیار کیا کہ تم ملکا (مجاہدین کا ایک مرکزی مقام) چلے جاؤ وہاں ایک شخص عبداللہ رہتا ہے اس کی مسجد میں جا کر ٹھہر جاؤ اور اس کے ذریعہ پوری معلومات حاصل کرو کہ جماعت مجاہدین کو کہاں کہاں سے مدد ملتی ہے، پولیس افسر کے لڑکے نے جا کر مسجد میں قیام کیا، اس زمانے میں مجاہدین استھانہ پیش قدمی کی تیاریاں کررہے تھے، یہ بھی ان کے ساتھ استھانہ گیا اور پوری معلومات حاصل کرکے باپ کے پاس لوٹ آیا اور پوری تفصیل بتادی کہ مجاہدین اور اسلحہ کی فراہمی اور روانگی کا ذمہ دار محمد جعفر تھانیسری ہے، اس پولیس افسر نے اپنے افسر کپتان موزلی کو مفصل حالات بتائے اس نے رپورٹ، انسپکٹر جنرل پولیس کے پاس بھیج دی اور ضلع انبالہ سپرنٹنڈنٹ پولیس کپتان پارسنز کو اس سلسلہ میں مزید تحقیقات کا حکم ملا۔

انبالہ سازش کیس

مولانا محمد جعفر تھانیسری نے اس مقدمہ پر اپنی کتاب تواریخ عجیب عرف کالا پانی میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے ان کا بیان ہے کہ 11 دسمبر 1863 کو پولیس افسر ڈپٹی کمشنر کو مفصل اطلاع دے کر جب بنگلہ سے نکلا تو ان کے ایک ہمدرد نے اپنے ملازم کو تھانیسر بھیج کر اطلاع کرانی چاہی لیکن رات زیادہ گذر چکی تھی اس نے سوچا کہ صبح اطلاع کروں گا اسی رات کو کپتان پارسنز ایک بڑی پولیس فورس لے کر مولانا محمد جعفر تھانیسری کے گھر پر پہونچے گیا اور گھر کو گھیر لیا اور انکو جگا کر تلاشی کا وارنٹ دکھایا، اسی شب مولانا محمد جعفر نے مجاہدین کو روپے کے متعلق ایک خط محمد شفیع ٹھیکیدار انبالہ کے نام لکھ رکھا تھا اور وہ خط بیٹھک میں موجود تھا تلاشی میں وہ خط پولیس کو مل گیا جس میں چند ہزار اشرفیاں روانہ کرنے کا ذکر تھا، بعض دوسرے خطوط بھی پولیس کو ملے، چونکہ مولانا جعفر کی گرفتاری کا وارنٹ نہیں تھا اس لئے کپتان ان کو گرفتار نہ کر سکا، البتہ منشی عبدالغفور اور ایک بنگالی لڑکے عباس کو گرفتار کر کے لے گیا، مولانا جعفر خانہ تلاشی کے بعد کسی محفوظ مقام کی تلاش میں تھانیسر سے دہلی اور وہاں سے علی گڑھ پہنچ گئے کپتان پارسنز نے انکے بھائی محمد سعید کو زدوکوب کر کے مولانا جعفر کا پورا پتہ حاصل کر لیا، دوسرے دن علی گڑھ سے گرفتار کر کے انبالہ لایا، اس دوران محمد شفیع ٹھیکیدار منشی عبدالکریم اور بعض دوسرے لوگ گرفتار کر لئے گئے، مولانا جعفر کے ایک خط سے عظیم آباد کے مرکز کا پتہ چل گیا تھا اس لئے وہاں مولانا احمد اللہ، مولانا محمد یحییٰ اور مولانا عبدالرحیم بھی گرفتار کر لئے گئے، اسی دوران مجاہدین کیلئے رقم لے جاتے ہوئے حسینی تھانیسری بھی گرفتار ہو گیا، ان سب کو انبالہ پہونچایا گیا، گرفتاری کے بعد جو اذیتیں ان حضرات کو پہونچائی گئیں اس کا کچھ اندازہ مولانا محمد جعفر کی خودنوشت آپ بیتی سے ہوتا ہے، مولانا جعفر تھانیسری اپنی کتاب کالا پانی میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''ہمارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، پیروں میں بیڑیاں، جسم پر جیل کا لباس اور کمر پر لوہے کی سلاخیں تھیں، انگریز نے ہمارے لئے لوہے کے قفس تیار کروائے، اور ہمیں ان میں ڈال دیا گیا، ان پنجروں میں چونچ دار سلاخیں بھی لگوائیں جس کی وجہ سے ہم نہ سہارا لے سکتے تھے اور نہ بیٹھ سکتے تھے، ہماری آنکھوں سے آنسو اور پیروں سے خون بہہ رہے تھے، غدر کے ملزمان انگریزوں کی نگاہ میں اتنے بڑے مجرم سمجھے گئے کہ 1857 میں پکڑے گئے لوگوں کو یا تو

سرعام پھانسی دے دی گئی یا بہت سے لوگوں کو اسی جزیرہ انڈمان میں موت سے بدتر زندگی گزارنے کے لیے بھیج دیا گیا۔"

یہ لوگ اپنے وقت کے نہایت معزز، خوشحال رئیس افراد تھے، یہ مقدمہ انبالا میں کپتان ٹائی ڈپٹی کمشنر کی عدالت میں پیش ہوا۔

مندرجہ ذیل اصحاب اس مقدمہ سازش و بغاوت کے ملزم بنائے گئے:

1-شیخ محمد شفیع ٹھیکیدار جو ایک رئیس کبیر آدمی تھے انکی جائداد پچاس لاکھ سے کم نہیں تھی۔

2-مولوی محمد جعفر تھانیسری تجارت اور زمینداری کا کاروبار خاصا وسیع تھا۔ 1857 کے ہنگاموں میں شریک تھے۔

۳-مولانا یحییٰ علی عظیم آبادی عمر ۴۷ سال راز داری کے خیال سے نام بدل کر محی الدین رکھ لیا گیا تھا۔

۴-مولانا عبدالرحیم عظیم آبادی عظیم آباد کے رئیس، جاگیردار، عمر تقریباً ۲۸ سال تھی۔

۵-میاں عبدالغفار، مجاہدین احتراماً انکو سیدی میاں عبدالغفار کہا کرتے تھے۔

6-قاضی میاں جان ساکن کمارکھلی ضلع بینیہ، انکے متعدد نام تھے اور تما کارکنوں میں سے تھے۔

7-عبدالکریم انبالوی۔ عمر ۳۵ سال تنفع ٹھیکیدار کے مختار تھے۔

۸-حسینی ابن محمد بخش-عمر ۲۵ سال مولانا محمد جعفر کے معاون تھے۔

9-عبدالغفور شاہ آبادی-عمر ۲۵ سال

10-حسینی عظیم آبادی عمر ۳۵ سال

11-الٰہی بخش ابن کریم بخش، یہ مولانا احمد اللہ عظیم آبادی کے مختار تھے مجاہدین کو زیادہ تر رقمیں انھیں کے ذریعہ بھیجی جاتی تھیں۔

مشہور انبالہ سازش کیس کے سلسلہ کا یہ پہلا مقدمہ تھا، پولیس نے کچھ لوگوں کو پکڑ کر اور پھانسی کی دھمکی دے کر سرکاری گواہ بنا لیا تھا اور ان سے جبراً شہادتیں لے کر ان کے مقدمات کو شیشن جج کے سپرد کر کیا گیا۔ اور سب کو جیل میں اکٹھا کر دیا گیا، ملزمین کے وکلا نے عدالت میں معرکۃ الآراء بحثیں کیں؛ مگر حکومت کی ہدایات کے زیر اثر سخت سزاؤں کا پہلے ہی فیصلہ کیا جا چکا تھا، اسلئے ہربرٹ ایڈورڈز نے جو فیصلہ لکھا

وہ روداد کے ایک سو پانچ صفحات پر مشتمل ہے، جس میں مولانا جعفر تھانیسری، مولانا یحییٰ عظیم آبادی اور ٹھیکیدار محمد شفیع کو سزائے موت مع ضبطی جائداد کی سزا سنائی گئی اور دوسرے حضرات کو حبس دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا سنائی گئی۔

فیصلہ 2 مئی 1864 کو سنایا گیا، جوڈیشنل کمشنر پنجاب کی عدالت میں اپیل کی گئی اس وقت رابرٹس جوڈیشنل کمشنر تھا، اس نے ٦٨ صفحات میں اپنا فیصلہ لکھا۔ جس میں مولانا یحییٰ علی مولونا محمد جعفر اور شیخ محمد شفیع کی سزائے موت کو حبس دوام بہ عبور دریائے شور میں بدل دیا۔

فیصلہ کے بعد کچھ ملزمان کو انبالہ جیل میں رکھا گیا، مولانا یحییٰ علی عبد الغفار اور مولانا جعفر کو دوسرے قیدیوں کے ساتھ انبالہ سے پیدل روانہ کیا گیا لدھیانہ، پھلور، جالندھر اور امرتسر کے راستے لاہور پہونچایا گیا، اس پورے سفر میں ان کے بیڑیاں اور ہتھکڑیاں پڑی ہوئی تھیں چند ماہ لاہور جیل میں گذرے، پھر وہاں سے ملتان وہاں سے کوئٹہ پھر کراچی بھیجے گئے، پھر بادبانی جہاز سے بمبئی تھانہ جیل میں بھیج دیئے گئے، 1865 کو بمبئی سے جمنا جہاز سے چل کر 11 جنوری 1864 کو کالے پانی (جزیرہ انڈمان) پہنچے، مولانا عبدالرحیم صاحب کو علیحدہ دوسرے جہاز کے ذریعہ کالے پانی بھیجا گیا۔

چنانچہ 30/ دسمبر 1882 کو رہائی کا حکم آ گیا، 22/ جنوری 1883 کو انڈمان پہونچا۔ پھر 9/ نومبر 1883 کو 17 سال دس مہینے کے بعد انڈمان سے روانہ ہوئے 13/نومبر 1883 کو کلکتہ پہونچے پھر الٰہ آباد، کانپور، علی گڈھ، سہارنپور ہوتے ہوئے 21/نومبر 1883 کو رات 9 بجے انبالہ چھاؤنی اسٹیشن پر پہونچ گئے، کچھ کم بیس سال کے بعد دوبارہ وطن میں آزادی کی زندگی نصیب ہوئی۔

مولانا یحییٰ علی عظیم آبادی

مولانا یحییٰ علی خلف مولانا الٰہی بخش (1822ء) کے قریب پیدا ہوئے۔ بڑے بھائی احمد اللہ سے علوم ظاہری کی تکمیل کیا۔ پھر مولانا ولایت علی کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور انھیں کے ہو کے رہ گئے۔ علم وفضل، زہد وتقویٰ اور ایثار وقربانی میں اپنی مثال نہیں رکھتے تھے۔ بہترین واعظ ومقرر اور اعلیٰ درجہ کے منتظم بھی تھے۔

مشہور انبالہ سازش کیس میں 5/ مارچ 1864ء کو گرفتار ہوئے۔ مولانا یحییٰ علی کو انبالہ سازش کیس میں کالے پانی کی سزا ہوئی تھی، عدالت کے فیصلہ سنانے کے بعد مولانا موصوف کو انبالہ سے لاہور، ملتان، کراچی اور بمبئی کی جیلوں میں منتقل کرتے ہوئے 11/جنوری 1866ء کو جزیرہ انڈمان بھیجا، ان کو روس آئی

لینڈ میں رکھا گیا مولانا موصوف سرکاری کام کے بعد تلاوت اور ذکر ودعا میں مصروف رہتے۔ تھے، اور قیدیوں کو نیک کاموں کی تلقین کرتے رہتے تھے۔

کالے پانی پہونچنے کے دوسال بعد بیمار ہو گئے، بیماری شدید ہوتی گئی حلق سے پانی اترنا بھی دشوار ہو گیا پھر بھی ذکر اللہ زبان پر جاری تھا ۲۰ فروری 1868ء کو جان جان آفریں کو سپرد کر دی، انڈمان میں دوسال ایک ماہ اور نو دن گزارے، مولانا کی وفات کا تمام جزیروں میں اعلان کر دیا گیا، ہر جزیرے سے تجہیز وتکفین میں شرکت کے خیال سے بہت سے لوگ آئے، اندازہ کیا جاتا ہے کہ آپکے جنازہ میں چار پانچ ہزار کے قریب مسلمان شریک ہوئے تھے، کئی مرتبہ نماز جنازہ پڑھی گئی اور وہیں پر روس آئی لینڈ میں سپرد خاک کئے گئے، مسلمانوں کے امیر، رئیس وخوشحال خاندان کے فرد، علم وفضل اور زہد وتقوی مثالی جہاد آزادی اور اسلام کی سربلندی کی راہ میں طرح طرح اذیتیں برداشت کرتے ہوئے وطن سے ہزاروں میل دور ایک ویران جزیرہ میں آسودہ خواب ہوئے۔

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ

آپ ۱۹۰۰ء میں سیوہارہ ضلع بجنور کے ایک تعلیم یافتہ معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ فیض عام سیوہارہ میں حاصل کی اور دورۂ حدیث کے لئے دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے۔ ۱۹۲۲ء میں سندِ فراغت حاصل کی پھر دارالعلوم دیوبند، ڈابھیل اور کلکتہ وغیرہ کے مدرسوں میں تدریس کے فرائض انجام دیئے۔

مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی۔ نیشنلسٹ مسلمانوں کا مجاہد اعظم، قوم پرور اور مسلمانوں کا انتہائی طاقتور لیڈر گاندھی پنڈت جواہر لال نہرو کا معتمد، کانگریس درکنگ کمیٹی کا ممبر، مسلمانوں نے اپنے اس لیڈر کو ادب واحترام کے جذبات کے ساتھ مجاہد ملت کا خطاب دیا تھا اور اپنی بے مثال خدمات کے لحاظ سے وہ صحیح معنی میں اس خطاب کے مستحق تھے۔ ۱۹۴۷ء میں آزادی کے بعد آگ اور خون کی بارش میں انھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی حفاظت کی جو عظیم الشان خدمت اور بے مثال کارنامہ انجام دیا ہے اور اپنی پر جوش اور حوصلہ افزا تقریروں سے مسلمانوں کے دلوں سے خوف و ہراس اور یاس وقنوطیت کو دور کیا ہے اسی کا صدقہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمان اور اسلام زندہ بچ گئے ورنہ تقسیم ملک کے عذاب میں اسلامی ہند آج اسلامی تہذیب و تمدن کا بڑا ہی عبرتناک کھنڈر بن کر رہ گیا ہوتا اور خدا جانے کیا کیا ہوتا؟

ملک میں ہونے والے فسادات بلکہ یکطرفہ نسل کشی اور مسلمانوں کے وجود کو اس سرزمین سے مٹا

دینے کے سلسلہ میں جومنظم پلاننگ تھی اس کونا کام بنا کرمسلمانوں میں استقلال کی طاقت پیدا کرنے میں مسیحا کا کردارانجام دیا ہے، آزاد ہندوستان کی پارلیمنٹ میں فسادات کے موضوع پرجیسی جیسی تقریریں کی ہیں یہ انھیں کا دل گردہ تھا، جواہرلعل نہرو حضرت مولانا کوبغیر کسی تحفظ کے متاثرہ علاقوں میں جانے سے روکا کرتے تھے، اور اسی ہنگامہ خیز حالات میں آپ کی خدمات کے پیش نظر آپ کے پیر طریقت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ فرمایا کرتے تھے کہ حفظ الرحمٰن میری عمر کی تمام نیکیاں لے لے اور دہلی کے ہولناک فساد میں جومسلمانوں کی خدمت کی ہے مجھے دے دے تب بھی میں کامیاب رہوں گا۔

آزادی کے بعد ملتِ اسلامیہ کے دینی تشخص کو برقرار رکھنے کے لئے دینی تعلیم کی ملک گیر تحریک چلائی اورآل انڈیا تعلیمی بورڈ بنایا، نیز دہلی کے مشہور دینی مدارس جو وہاں کی مسلم آبادی کے نقل مکانی کی وجہ سے ویران ہوکررہ گئے تھے ان کو نئے سرے سے زندہ کیا، خواجہ اجمیریؒ کی درگاہ اور مدرسہ عالیہ کلکتہ کی ازسرنو زندگی کے سامان مہیا کئے۔اسلامی اوقاف کے متعلق ایک مسودہ قانون تیار کروایا جس کو ۱۲/اپریل ۱۹۵۱ءکو جمعیۃ علماء کی طرف سے ممبر پارلیمنٹ محمد احمد کاظمی ایڈوکیٹ نے پارلیمنٹ میں پیش کیا اور آپ نے اس کی ضرورت پر وضاحتی تقریر فرمائی۔آزاد ہندوستان میں دستور ساز اسمبلی کے ممبر بنائے گئے، آئین میں اقلیتوں کو جوحقوق دیئے گئے ہیں ان کی ترتیب وتدوین میں آپ کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ تقسیمِ ہند کے بعد تارکین وطن کی چھوڑی ہوئی املاک وجائیداد کے متعلق محکمہ کسٹوڈین بنایا گیا تھا، اوراس محکمہ نے مسلمانوں کوغیر معمولی نقصان پہونچایا تھا، اس محاذ پر بھی حضرت مجاہد ملتؒ نے نمایاں خدمات انجام دیں ستمبر ۱۹۴۵ءمیں آل پارٹیز مسلم کانفرنس بلائی جس کی بنیاد پر مسلم پارلیمنٹری بورڈ کی تشکیل عمل میں آئی تھی نیز جب مجاہد ملتؒ کو اس بات کا شدت کے ساتھ احساس ہونے لگا کہ مسلمانوں میں مایوسی اور بددلی کی فضا پنپتی جارہی ہے تو آپ نے جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے کل ہند ''مسلم کنونشن'' بلانے کا فیصلہ کیا باوجودیکہ کانگریس کے اہم لیڈران اور خود وزیراعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو نے اس کی مخالفت کی مگر مولانا مرحوم اپنی جگہ اٹل رہے اور ۱۰۔۱۱/جون ۱۹۶۱ءکو یہ تاریخ ساز کنونشن دہلی میں منعقد ہوا، جس میں جواہر لال نہرو نے لال بہادر شاستری جو وزیر بے قلم دان تھے اپنے نمائندے کی حیثیت سے کنونشن میں بھیجا، پنڈت جواہر لال نہرو باوجودیکہ شروع میں مسلم کنونشن کے مخالف تھے، مگر بعد میں انہوں نے بھی مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ کی اصابت رائے کو تسلیم کیا۔

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ نے 1942 سے لیکر 1962 تک بیس برس کا عرصہ جمعیۃ علماء ہند کی

ہنگامہ خیز سرگرمیوں میں گزارا۔ مولانا حفظ الرحمن ایک بڑے قومی لیڈر ہی نہیں تھے بہت برے عالم، بہت بڑے مصنف اور بہت بڑے محقق تھے قصص القرآن چار جلدوں میں، اسلام کا اقتصادی نظام، بلاغ مبین، اخلاق اور فلسفۂ اخلاق جیسی عظیم الشان کتابیں ان کے علمی مقام ومرتبہ پر شاہد عدل ہیں۔

آزادی کے بعد کی شب وروز کی جدو جہد نے ان کو تھکا ڈالا تھا، آپ کو کینسر کا مرض لاحق ہو گیا ہندوستان میں علاج کرایا گیا مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی، بالآخر علاج کے لئے امریکہ تشریف لے گئے، آئے تو زندگی ساتھ تھی لیکن جب اپنے وطن پہونچے تو زندگی نے ساتھ چھوڑ دیا، یہ غمناک سال 1962 ہے۔

○○○

نواب سراج الدولہ

مفتی اشرف علی قاسمی ❖

۲ رلاکھ ۱۷ر ہزار مربع میل پر پھیلی سلطنت بنگال میں بہار اور اڑیسہ کے علاقے شامل تھے، یہ علاقہ تجارتی اور جغرافیائی اعتبار سے بہت اہمیت کا حامل تھا، شمال میں ہمالیہ اور جنوب میں خلیج بنگال کی وجہ سے بحر ہند سے جڑا ہوا تھا۔

۱۵۷۶ء میں پرتگالیوں نے تجارت کے لئے گوا میں قدم جما لئے جو اکبر بادشاہ کی اجازت سے اپنی تجارت کا دائرہ بنگال کے دریائے ہگلی تک پھیلا چکے تھے، ادھر انگریز سورت شہر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے اپنی ایک کمپنی قائم کر چکے تھے۔ شاہ جہاں کی اجازت سے اس کمپنی نے بھی پرتگالیوں کے بعد ہگلی میں تجارتی سرگرمیوں کا آغاز کر دیا تھا، پوری مارکیٹ میں بنگال کے کپڑے کی مانگ کی وجہ سے فرانسیسی بھی ادھر کا رخ کر رہے تھے، یہی چیزیں اس علاقہ کی خوش حالی کا سبب تھیں اور دنیا کی نگاہیں ان کی طرف پڑتی تھیں۔

زمینی طور پر گنگا اور برہم پتر سمیت کئی دریاؤں کی وجہ سے یہاں کی زمین بہت زرخیز بھی تھی، چاول اور گنے کے علاوہ کپاس کی کھیتی ذریعہ آمدنی تھی، کپاس کی وجہ سے کپڑے کی صنعت عروج پر تھی۔

اورنگ زیب

بنگال مغل سلطنت کا ایک صوبہ تھا، ان کی ماتحتی میں یہاں گورنر مقرر ہوتے تھے۔ اورنگ زیب نے ۱۶۹۷ء میں اپنے پوتے شاہ عالم اول کے بیٹے شہزادہ عظیم الشان کو گورنر مقرر کیا، ساتھ ایک درباری معتمد میر تقی خان کو اس صوبے میں دیوان کا عہدہ دیا، جنہیں بعد میں مرشد علی خان کا خطاب ملا۔

دیوان کا کام مغل سلطنت کی ریاستوں کے مالی معاملات کی نگرانی کرنا ہوتا تھا، ۱۷۱۹ء میں جب محمد شاہ مغل سلطنت کے فرماں روا بنے تو مرشد قلی خان کو بنگال کا گورنر بنا دیا گیا اور انہیں صوبائی دارالسلطنت

❖ معتمد امور انتظامی: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

مخصوص آباد کا نام بدل کر مرشد آباد رکھنے کی اجازت دے دی۔ یہیں سے بنگال ایک خود مختار ریاست بن گئی اور بنگال نے ایک خود مختار سلطنت کی حیثیت حاصل کرنا شروع کیا۔

تخت نشینی کے جھگڑوں کی وجہ سے مغل حکومت کمزور ہونے لگی، فوجی قوت تو کمزور ہوئی ہی مالی حالت بھی کمزور ہونے لگی، دہلی کی مرکزی مغل سلطنت بس اتنی ہی بات پر خوش تھی کہ صوبے برائے نام ہی سہی ہر سال قیمتی نذرانے بھیجتے ہیں اور وفاداری کا دم بھرتے ہیں۔ اس حکمت عملی کے تحت مرکزی حکومت مغلیہ بنگال، دکن اور کرناٹک جیسے صوبے گورنر کے حوالے کر دیتے تھے، انہیں کو اب ناظم کہا جانے لگا۔

عام طور پر صوبوں کا گورنر بادشاہ مقرر کرتا تھا؛ لیکن ان صوبوں میں گورنر اتنے خود مختار ہو چکے تھے کہ اپنے جانشین ہی خود مقرر کرواتے تھے؛ اس لیے مرشد قلی خان نے اپنی زندگی ہی میں اپنے نواسے سرفراز خان کو اپنا جانشین مقرر کر دیا۔

۱۷۲۷ء میں مرشد قلی خان کا انتقال ہوا تو اس کے خاندان میں اقتدار کی کشمکش شروع ہو گئی، پہلے ان کے داماد شجاع الدین ان کے ولی عہد مقرر ہوئے اور اپنے ہی بیٹے سرفراز خان کی جگہ نواب بن گئے۔ پھر ۱۷۳۹ء میں شجاع الدین کی وفات کے بعد بالآخر سرفراز خان بنگال کے حکمران بنے۔

سراج الدولہ کے نانا علی وردی خان بھی اس دور میں بنگال کے بااثر شخصیت بن چکے تھے۔

سرفراز خان نااہل حکمران تھا۔ ۱۷۴۰ء میں علی وردی خان نے ان کا تختہ پلٹ دیا اور اقتدار سنبھال لیا۔ علی وردی خان کے بعد بنگال سیاسی طور پر بالکل آزاد ہو گیا اور انہوں نے سالانہ نذرانہ بھیجنا بند کر دیا۔

علی وردی کی جانشینی

علی وردی خان بنگال کی حکمرانی اپنے خاندان ہی میں رکھنا چاہتے تھے، ان کی کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی؛ اس لئے انہوں نے اپنی موت سے ۳؍برس قبل ہی اپنی چھوٹی بچی کے فرزند اور اپنے نواسے محمد مرزا کو اپنا جانشین مقرر کر دیا، محمد مرزا کے والد زین الدین احمد تھے، جو بہار کے حکمران تھے، والدہ امینہ بیگم تھیں جو علی وردی خان نواب بنگال کی پھوپھی کی بیٹی تھیں، نواب کی پیدائش مرشد آباد بنگال میں ۱۷۳۳ء میں ہوئی تھی۔ یہی مرزا محمد نواب سراج الدولہ کے نام سے مشہور ہوئے، دیگر بیٹیوں اور ان کی اولاد کی جانب سے اس فیصلہ کی مخالفت کے پیش نظر علی وردی خان نے اپنی زندگی ہی میں سراج الدولہ کی مدد کے لئے اپنے دربار کے تین سب سے وفادار اور طاقتور افراد کو مدد کرنے پر مامور کر دیا تھا:

۱-میر جعفر کماندار
۲-جگت سنگھ وزیر خزانہ
۳-ولبھ رائے وزیر اعظم

چونکہ نواب علی وردی خان کی کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی؛ اس لئے شروع ہی سے خیال کیا جارہا تھا کہ مرشد آباد یعنی بنگال کے تخت کے وارث نواب سراج الدولہ ہی ہوں گے، سراج الدولہ کو خاندان کا خوش قسمت بچہ سمجھا جاتا تھا، انہیں اپنے نانا کی خصوصی شفقت حاصل تھی اور مستقبل کے نواب کی حیثیت سے تمام ضروری تربیت بھی نواب علی وردی نے اپنے زیر نگرانی کی۔ امور سلطنت سکھاتے، کئی جنگوں میں علی وردی خان نے انہیں اپنے ساتھ شریک سفر رکھا۔ مثلاً ۱۷۴۶ء میں مہاراشٹر میں مرہٹوں کو شکست دیتے وقت مکمل طور پر سفر میں شریک تھے۔

علی وردی کا انتقال

۹/اپریل ۱۷۵۶ء کو علی وردی خان کا انتقال ہوا، ان کے انتقال کے بعد انگریزوں کی مخالفت کے باوجود تخت نشینی نواب سراج الدولہ کے حصہ میں آئی۔ اس تخت پر جو برصغیر کی سب سے امیر ترین ریاست تھی۔

۲۳/سال کی عمر میں دادا کے جانشین بنے، وہ بچپن ہی سے ذہین اور بہادر سمجھے جاتے تھے، ان کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر دادا نے انھیں اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ اور یہیں سے خاندانی اختلاف شروع ہوا، وہ محلاتی سازشوں سے الگ تھے؛ اسی لئے اپنی انتظامیہ میں وسیع پیمانہ پر تبدیلیاں کیں، انہی تبدیلیوں میں انہوں نے بنگالی فوج کمانڈر میر جعفر کو تبدیل کر دیا، کہا جاتا ہے کہ وہ محلاتی سازشوں میں پوری طرح ملوث تھا، اسی بنا پر فوج سے اس کو برطرف کر دیا گیا، نواب سراج الدولہ بنگال میں انگریزوں کے بڑھتے اثر ورسوخ کے خلاف تھا، اس کے لئے اس کو دو محاذ پر مقابلہ کرنا پڑا، ایک: انگریزوں سے دوسرے: اپنے خاندانی مخالفین سے۔

اپریل میں حکومت ملی اور اگلے ہی ماہ مئی میں وہ اپنے ہزاروں سپاہوں اور پانچ سو ہاتھیوں کو لے کر اپنے باغی کزن کے مقابلہ پر روانہ ہوگئے؛ لیکن اسی وقت وہ راستے ہی میں تھے کہ واقعہ پیش آیا، جس نے نواب کو اپنا ارادہ بدلنے پر مجبور کر دیا، ہوا یہ کہ اس مہم کے دوران سراج الدولہ کی ملاقات ان کے نانا علی وردی کے قریبی ساتھی نارائن سنگھ سے ہوئی۔ نارائن سنگھ کلکتہ سے واپس آرہے تھے، انہوں نے سراج الدولہ کو بتایا کہ کلکتہ فورٹ ولیم سے رابرٹ برک نے اسے بے عزت کر کے نکال دیا ہے، انگریز ان کے سفیروں کو بدنام

کررہے ہیں، سراج الدولہ کواس نے اکسایا کہ اس کا بدلہ انگریز سے لیا جائے، تو اب سراج الدولہ کا خون کھول اٹھا، فوج لے کر قاسم بازار کی طرف چل پڑے، جو اُن کے دارالحکومت مرشدآباد کے قریب ہی تھا، یہاں یورپ کے ساتھ انگریزوں کی بھی فیکٹریاں تھیں، سراج الدولہ نے فیکٹری کا محاصرہ کرکے حملہ کردیا، کچھ دن تو یہ گولہ باری جاری رہی جس کے بعد انگریزوں نے نواب سراج الدولہ کے سامنے سرینڈر کردیا۔

فیکٹری کا سربراہ ولیم والٹس ہتھیار ڈالنے خود گیا اور مکاری کرتے ہوئے جھک کر کہنے لگا تمہارا غلام تمہارا غلام۔ کہا جاتا ہے کہ سراج الدولہ نے ولیم والٹس کو بہت برا بھلا کہا اور فوج کو گرفتار کرلیا، فوجیوں کو کوڑے بھی لگوائے۔

انگریزوں کے خلاف کامیابی نے اس کا حوصلہ بڑھادیا اور اس نے کلکتہ پر توجہ دیا اور انگریزوں کو خبر کرادیا کہ اگر میرے ملک میں رہنا ہے تو انہیں اپنے قلعے گرانے ہوں گے اور انگریزوں کو صرف تاجر بن کر رہنا ہوگا، فوجی بن کرنہیں، خبردار کیا کہ انگریزوں نے ان کا حکم نہ مانا تو اپنے علاقہ سے نکال باہر کریں گے، انگریز گورنر روجر ڈریک Rojer Dreck کو پیغام ملا؛ لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا، حالانکہ وہ نواب سراج الدولہ کی فوجی طاقت سے اچھی طرح واقف تھا، وہ جانتا تھا کہ قاسم بازار کی بڑی فیکٹری پر وہ قبضہ کرچکے ہیں۔

جواب نہ ملنے پر نواب سراج الدولہ سخت برہم ہوئے اور انہوں نے ستر ہزار فوج کے ساتھ کلکتہ پر چڑھائی کردی، انگریزوں کے پاس صرف پانچ سو فوجی تھے، جو نواب کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے، نواب نے انگریزوں کے قلعہ پر بمباری شروع کردی، انگریزی گورنر روجر ڈریک Rojer Dreck براہ دریائے ہگلی وہاں سے بھاگ نکلا، انگریزی فوجوں نے چند دن مقابلہ کیا؛ لیکن سراج الدولہ کی فوج کا مقابلہ وہ کہاں کرسکتے تھے، اس کی فوج نے قلعہ ولیم فورٹ کو شدید نقصان پہنچایا، انگریزوں کے ہندوستانی فوجی اور حواری بھی بھاگ نکلے، آخرش انگریزوں نے سرینڈر کردیا اور کلکتہ پر نواب کا قبضہ ہوگیا، قبضہ کے بعد فورٹ ولیم میں نواب نے اپنا دربار لگایا اور قیدیوں کے بارے میں فیصلہ کیا۔

پلاسی کی جنگ

کہا جاتا ہے کہ غلط فہمی کی بنا پر جنگ میں جو قیدی گرفتار کئے گئے تھے ان میں سے کئی فوجی ہلاک ہوگئے جس کی بنیاد پر انگریز اور سراج الدولہ کے درمیان عدم اعتماد پیدا ہوگیا، اس کے علاوہ چند انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی کے حملہ کی خبر نے سراج الدولہ کے نفرت میں اور اضافہ کردیا۔ ادھر مرہٹوں سے مقابلہ آرائی جاری تھی

جس کی وجہ سے انگریزوں کے خلاف وہ اپنی پوری فوج نہ لگا سکا، اس نے فرانسیسیوں کی مدد حاصل کرنے کا ارادہ کیا، اس کے بعد اس نے اپنی فوج کا بڑا حصہ مرشد آباد کے جنوب میں پلاسی کے مقام پر منتقل کر دیا۔

ان جنگی حالات کی وجہ سے بنگال کے تاجروں اور عوام میں عدم اعتماد کی فضا قائم ہوگئی، اسی دوران میر جعفر نے انگریزوں سے ساز باز کر کے نواب کے تخت کے بدلہ اپنی وفاداری ایسٹ انڈیا کمپنی کو دے دی۔ اس کے بعد پلاسی کے مقام پر فیصلہ کن جنگ لڑی گئی، نواب سراج الدولہ کے فورٹ ولیم پر قبضہ کے بعد انگریزوں نے اس کو حاصل کرنے کے لئے اپنی فوج روانہ کی۔ نواب سراج الدولہ سے پلاسی کے مقام پر جنگ ہوئی، اسی جنگ کے دوران نواب کا وفادار اہم بہادر سپاہی مردان خان شہید ہوگیا، اس پر نواب بہت غم زدہ ہوا اور سابقہ کمانڈر میر جعفر کو مشورہ کے لئے طلب کیا، یہی نواب سے تاریخی غلطی ہوگئی کہ میر جعفر جو انگریزوں سے ساز باز کر چکا تھا اسی پر اعتماد کر لیا، میر جعفر نے وزیر اعظم کی حیثیت سے ان حالات میں لڑائی بند کرنے اور فوج کو پیچھے ہٹانے کا مشورہ دیا، نواب نے اس کے مشورہ سے لڑائی روکنے کا حکم جاری کر دیا۔ اور جب بنگالی فوج کے سپاہی واپس اپنے خیموں میں جا رہے تھے، اسی دوران میر جعفر کی اطلاع پر انگریزوں نے فوج پر پیچھے سے حملہ کر دیا۔ اس اچانک حملہ سے فوج پریشان ہوگئی اور نواب کی فوج بھاگنے لگی اور نواب سراج الدولہ جیتی ہوئی جنگ ہار گئے اور انہیں فرار ہونا پڑا۔ پلاسی کی جنگ کلکتہ سے ۷۰/میل کے فاصلہ پر ۲۳/جون ۱۷۵۷ء کو ہوئی۔

میر جعفر کی تخت نشینی

۲۳/جون ۱۷۵۷ء ہندوستان کی تاریخ میں وہ منحوس گھڑی تھی، جب نواب سراج الدولہ کو اپنوں کی غداری کی وجہ سے شکست کھانی پڑی۔ ۲۹/جون کو میر جعفر کی انگریزوں کی وفاداری کے انعام میں بنگال کے نواب کی حیثیت سے تخت نشینی عمل میں آئی۔ انگریزوں نے اس وقت اعلان کیا کہ میر جعفر کی حکومت میں انگریز کسی طرح کی مداخلت نہیں کریں گے اور وہ صرف تجارتی معاملات پر توجہ مرکوز کریں گے؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میر جعفر ایک مہرہ تھا اصل اختیار تو کمپنی بہادر کے قبضہ میں تھا، اس جنگ کے بعد انگریزوں نے ۱۸۰/سال تک ہندوستان پر حکومت کی۔ میر جعفر ایک نااہل حکمران ثابت ہوا، اس کے اندر ملک چلانے کی صلاحیت بالکل نہیں تھی، وہ عیاش تھا اور سارا وقت رقص وسرود کی محفلوں میں ضائع کرتا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ سونے کا انڈا دینے والی امیر ترین ریاست مرشد آباد پلاسی جنگ کے بعد ۳/سال کے اندر ایک غریب ریاست بن گئی۔

نواب کے آخری ایام

پلاسی جنگ کے بعد ۲۳ رجون ۱۷۵۷ءکوسراج الدولہ اونٹ پر بھاگ نکلے اورطلوع آفتاب کے ساتھ ہی مرشد آباد پہنچ گئے، کلائیو نے میر جعفر کومشورہ دیا کہ وہ فوراًدارالحکومت مرشد آباد کی طرف کوچ کر جائیں۔راستہ میں سڑکوں پر چھوڑی ہوئی توپیں اور لاشیں ملیں۔سراج الدولہ عام لوگوں کا لباس پہن کر نکلے تھے،صبح ۳ربجے اپنی اہلیہ لطف النساء اوربعض قریبی رشتہ داروں کو لے کر جتنا سونا چاندی اپنے ساتھ لے سکتے تھے لے لیا اورمحل چھوڑ کر نکل گئے، ۳ردن کے بھوکے پیاسے تھے، ایک جگہ رک کر کھچڑی پکائی اور کسی قدر تھکان دور کیا،اس علاقہ کے ایک فقیر شاہ دانا نے مخبری کرتے ہوئے سراج الدولہ کے دشمنوں کووہاں پہنچنے کی خبر دے دی۔

یہ خبر ملتے ہی میر جعفر کے داماد میر قاسم نے ان کوگرفتار کرلیا۔اورآدھی رات کواسی محل میں میر جعفر کے سامنے پیش کیا گیاجس میں کچھ دن پہلے تک وہ رہا کرتے تھے،سراج الدولہ نے ہاتھ جوڑتے ہوئے اپنی جان کی امان مانگی،اس کے بعد سپاہی محل کے دوسرے کونے میں لے گئے،میر جعفر نے اپنے اہلکاروں سے مشورہ کیا کہ ان کے ساتھ کیا کیا جائے، ۳رائیں سامنے آئیں،اس پورے معاملہ میں میر جعفر نے اپنی کوئی رائے نہیں دی:

۱-مرشد آباد میں قید کر دیا جائے۔

۲-ملک سے باہر قید کر دیا جائے۔

۳-انہیں سزائے موت دی جائے۔

۴-بعض لوگوں نے کہا جیل میں زندہ رکھنا چاہیے،لیکن میر جعفر کا بیٹا میر میران سخت مخالف تھا۔

میران نے اپنے ساتھی محمدی بیگ کوسراج کو مارنے کاحکم دیا، جب محمدی بیگ سراج کے پاس پہنچا تو وہ سمجھ گیا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے،تو اس نے التجا کی کہ اسے مارنے سے پہلے وضو کرنے اورنماز کی اجازت دی جائے۔اپنا کام جلدمکمل کرنے کے لئے قاتلوں نے سراج کے سر پر پانی انڈیل دیا،وضوکرنے نہیں دیا گیاتو انہوں نے پانی طلب کیا،تبھی محمد بیگ نے سراج الدولہ پرحملہ کیا اورشہید کر دیا،اس طرح ۱۲رجولائی ۱۷۵۷ءکومجاہدین آزادی کی فہرست کےاس پہلے مجاہد نے اپنوں کی غداری کی وجہ سے اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کردی،بعض روایات میں ہے کہ نواب کونماز اورسجدہ کے دوران سرقلم کرکے سزائے موت دی گئی،اگلے دن سراج الدولہ کی نعش کو ہاتھی کی کمر پرلاد کرمرشد آباد کی گلیوں میں گھمایا گیا؛ تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہوجائے کہ

نواب کی حکومت ختم ہو چکی ہے، اب میر جعفر حکمران ہے، یہ ان کی شکست کا سب سے بڑا ثبوت تھا۔نواب کا مزار مرشدآباد کے باغ ''خوش باغ'' میں واقع ہے۔

جس مقام پر نواب سراج الدولہ کو شہید کیا گیا، یہ میر جعفر کی رہائش گاہ تھی، جسے بعد میں عوام نے نمک حرام دیوڑھی یا غدار محل کا نام دیا۔

میران نے نواب کے اہل وعیال کو ایک کشتی میں بٹھا کر دریائے ہگلی کے وسط میں ڈبو دیا، اس نے سراج الدولہ کے چھوٹے بھائی مرزا مہدی کو لکڑی کے دو تختوں کے درمیان رکھ کر پسوا دیا۔ بعد میں میران نے اس قتل کو سعدی کی کہاوت کو دہراتے ہوئے جائز قرار دیا کہ سانپ کو مارنے کے بعد اس کے بچے کو چھوڑنا کوئی دانشمندانہ بات نہیں ہے۔

جنگ کے بعد

جنگ کے ایک سال تک میر جعفر کا جلوہ رہا، اس کے بعد انگریزوں نے میر قاسم کو اس کا جانشین بنا دیا، میر قاسم اس کا داماد تھا، میر قاسم ۱۷۶۳ء تک حکمران رہا، یہ انگریزوں کا مخالف تھا، اس نے انگریزوں سے جنگ کی تو اس کو معزول کر کے دوبارہ میر جعفر کو نواب آف بنگال بنا دیا، جو وفات تک تخت نشین رہا، میر جعفر کی ولادت ۱۶۹۱ء اور وفات ۵رفروری ۱۷۵۶ء کو ہوئی، اس طرح ۶۷رسال کی عمر میں ہندوستان کی تاریخ کا یہ معروف غدار اس دار فانی سے دار بقا کو کوچ کر گیا۔ علامہ اقبالؒ نے ایسے غداروں کے بارے میں ایک شعر کہا جو ضرب المثل بن گیا:

جعفر از بنگال وصادق از دکن
ننگ ملت، ننگ دیں، ننگ وطن

○○○

حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ اور ہندوستان کی جلاوطن حکومت: ایک اجمالی نظر

مولانا عبید اختر رحمانی ❖

ہندوستان میں مسلمانوں نے تقریباسات آٹھ صدی تک حکومت کی، یہ حکومت مثالی نہ تھی لیکن اتنی بری بھی نہیں تھی جس کا آج پروپیگنڈہ کیا جارہاہے، یہ حکومت آج کے جمہوری دور میں موجودہ جمہوری حکومتوں سے بہت بہتر تھی، رعایا کا خیال، انصاف کالحاظ اورانصاف میں مذہب کی تفریق نہ کرنا ان حکومتوں کا بنیادی عنصر تھا، کچھ اکادکا بلکہ کئی واقعات ایسے بھی ہوئے جس میں کچھ زیادتی مسلم سلاطین کی رہی ہوگی، کون سی شخصی حکومت ان باتوں سے پاک ہوتی ہے؟ ہندوستان کی آزادی کے بعد جمہوری حکومت میں سینکڑوں فسادات ہوئے، جس میں ہزاروں مسلمان مارے گئے اور قاتلوں کو کبھی کوئی سزانہیں ملی، جب جمہوری حکومت میں یہ سب ہوسکتاہے تو پھر شخصی اورسلطانی حکومت میں اگر کچھ اس طرح کے واقعات ہوئے تو اس پر واویلا اورہندوؤں پراتیاچار کارونادھونا کیوں؟

مسلمانوں کے اقتدار کی صدیوں میں ہندوؤں اورمسلمانوں میں مثالی تعلقات قائم رہے، یہ مثالی تعلقات انگریزوں کیلئے بھی باعث رشک تھے جہاں یوروپ بھر میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ میں مذہبی اختلاف کی بناپرایک دوسرے کا'قتل' عام بات تھی، وہیں ہندوستان میں ہندومسلم اپنے مذہبی اختلافات کے باوجودایک دوسرے کےساتھ شیروشکر ہوکر رہ رہے تھے، ۱۸۸۷ء میں جب انگریزوں کے خلاف ہندومسلمانوں نے متحد ہوکر انگریزی اقتدار کے خلاف علم بغاوت بلند کیا،اس سے انگریزارباب اقتدار گھبراگئے اورانہیں خدشہ ہوگیا کہ اگرہندومسلم اتحادیوں ہی باقی رہاتو پھران کی حکومت کا چل چلاؤ قریب ہے،

❖ نگراں شعبۂ تحقیق: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

انہوں نے ہندومسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوششیں شروع کردیں، اس کیلئے تاریخ کوانہوں نے اپنا سب سے اہم ہتھیار بنایا۔

زیادتی کے اکادکا اور انفرادی واقعات کو مذہبی رنگ دیا گیا، اوراس کوافراد کی لڑائی کے بجائے اسلام اور ہندومذہب کی لڑائی بتائی گئی، ان واقعات میں مبالغہ آرائی کو بہت زیادہ دخل دیا گیا، بسااوقات بلکہ بیشتر خود سے من گھڑنت افسانے مسلمانوں کی ظلم وزیادتی کے تراشے گئے ،قوموں کی نفسیات یہ ہے کہ محکوم قوم اپنے حاکموں کی ظلم وزیادتی کے ہر قسم کے واقعات کو بلا تحقیق قبول کرلیتی ہے، ہندواگرچہ حکومت کے اہم عہدوں پر مسلم دور اقتدار میں فائز تھے ؛لیکن چونکہ وہ سیاسی طور پر محکوم تھے لہٰذا ان کے دانشور طبقے میں یہ بے بنیاد واقعات قبولیت کی سند حاصل کرنے لگے، دانشور طبقے کا جب یہ حال ہوتو پھرعوامی طبقے کا پوچھنا ہی کیا۔

ایک مثال پیش کی جاتی ہے، مشہور مورخ بی این پانڈے لکھتے ہیں:

> ایک دن دوپہر کو اینگلو بنگالی کالج کے کچھ طلبہ آئے اور انہوں نے یہ درخواست کی کہ میں ان کے ہسٹری ایسوسی ایشن کا افتتاح کردوں، چونکہ وہ کالج سے سیدھے آئے تھے، توان کے ساتھ ان کی کتابیں بھی تھیں، میں ان کتابوں میں سے ہندوستان کی تاریخ کے ورق الٹنے لگا، جب میں ٹیپوسلطان کے سبق پر پہنچا تو دیکھا اس میں درج تھا: ''تین ہزار برہمنوں نے اس لیے خودکشی کرلی کہ ٹیپوسلطان انہیں زبردستی مسلمان بنانا چاہتا تھا''میں نے مورخ کا نام دیکھا تو لکھا تھا، مہامہو پادھیائے ڈاکٹر ہری پرسادشاستری کلکتہ یونیورسٹی کے سنسکرت ڈیپارٹمنٹ کے صدر۔ دوسرے ہی دن میں نے انہیں خط لکھا اوران سے التجا کی مہربانی فرما کر مجھے یہ اطلاع دیں کہ یہ واقعہ انہوں نے کہاں سے لیا، چار بار یاددہانی کے بعد انہوں نے مجھے اطلاع دی کہ یہ واقعہ انہوں نے میسور گزیٹر سے لیا ہے، میسور گزیٹر کی کوئی جلد نہ الہ آباد میں ملی، نہ کلکتے میں، میں نے ڈاکٹر سپرو کے مشورے سے اس کے متعلق میسور کے دیوان سر مرزا اسماعیل کو خط لکھا، سر مرزا اسماعیل نے میرا وہ خط یونیورسٹی کے وائس چانسلر سر برجیندر ناتھ سیل کے پاس بھیج دیا، سیل صاحب نے مجھے اطلاع دی کہ میرا وہ خط انہوں نے

پروفیسر سری کانتیہ کے پاس بھیجا ہے جو اس وقت میسور گزیٹر کو ایڈٹ کر رہے ہیں، ایک ہفتے کے بعد پروفیسر سری کانتیہ نے مجھے اطلاع دی کہ میسور گزیٹر میں یہ واقعہ کہیں نہیں ہے، تاریخ کی وہ کتاب اتر پردیش ، بہار ،اڑیسہ ، بنگال اورآسام کے ہائی اسکول کی ٹیکسٹ بک تھی ، لاکھوں معصوم لڑکے ہر سال اس کتاب کو پڑھتے ہیں، اس واقعہ کا ان کے دل پر کیا اثر ہوتا ہوگا ؟

میں نے پروفیسر سری کانتیہ کو لکھا کہ وہ مہربانی فرما کر مجھے اطلاع فرمائیں کہ ٹیپو سلطان میں کیا تعصب تھا، مجھے پھر اطلاع دی گئی کہ ٹیپو سلطان کا سپہ سالار کرشنا راؤ برہمن تھا، اور اس کا وزیر اعظم پورنیہ بھی برہمن، پروفیسر کانتیہ نے ۱۵۶/مندروں کی فہرست بھیجی، جنہیں ٹیپو سلطان ہر سال تحفے اور چڑھاوا بھیجا کرتا تھا، خود ٹیپو سلطان کے قلعہ کے اندر سری رنگناتھ کا مندر تھا جہاں حسب معمول روز صبح ناشتے سے پہلے ٹیپو سلطان رنگناتھ سوامی کے درشن کرتا تھا، (چونکہ اس بارے میں کوئی معاصر مورخ کی شہادت نہیں ہے، اس لیے درشن کا یہ مطلب مراد لیا جائے کہ ٹیپو سلطان ادھر سے گزرتے تھے تو نظر پڑ جاتی تھی یا دیکھ ریکھ کے لیے جاتے ہوں گے) مجھے سرینگری مٹھ کے جگت گرو شنکر آچاریہ کے ٹیپو سلطان کے نام لکھے ہوئے ایک درجن کنڑ زبان کے خطوط کی فوٹو کاپی بھیجی گئی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ شنکر آچاریہ اور ٹیپو سلطان میں بے حد محبت تھی، اپنے زمانے کے ہندوستان کے راجاؤں اور نوابوں میں ٹیپو سلطان اور اس کے والد ہی ایسے شخص تھے جنہوں نے انگریزوں کے ساتھ مل کر کسی کو دھوکہ نہیں دیا، ٹیپو سلطان کے ساتھ انگریزوں کی کئی بار جنگ ہوئی اور آخر میں ایک بہادر وطن پرست کی طرح لڑتے ہوئے اس نے شہادت حاصل کی ، نامعلوم لاشوں کے ڈھیر سے جب اسے کھوج کر نکالا گیا تو انگریز جنرل نے دیکھا کہ اس نے تلوار کی مٹھ کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

میں نے یہ تمام خط وکتابت کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو بھیجی اور ان سے

درخواست کی کہ اگر وہ اس خط وکتابت سے مطمئن ہیں کہ شاستری کی کتاب میں دیا ہوا واقعہ غلط ہے تو اس پر کارروائی کریں، ورنہ یہ خط وکتابت مجھے واپس کردیں، بہت جلد نہ صرف وائس چانسلر کا جواب آیا؛ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان کا حکم نامہ بھی آیا کہ شاستری کی تاریخ کی کتاب ہائی اسکول سے خارج کی جاتی ہے۔(۱)

اس واقعہ میں عبرت کے کئی پہلو ہیں، یہ واقعہ ۱۹۲۸ کا ہے، اس وقت اگر سنگھی ذہن کے لوگ نصاب میں اس طرح کی حرکتیں کررہے تھے تو اب ان کی کارروائی کس حد تک آگے بڑھ چکی ہوگی، کیا ہم نے کبھی مورخین کا ایک بورڈ، ایک پینل بنایا، جس میں آر ایس ایس کے اسکولوں میں، یا سرکاری اسکولوں میں پڑھائی جانے والی کتابوں کا جائزہ لیا جائے اور غیر مستند واقعات سے محکمہ تعلیم، یونیورسٹی اور جس بورڈ سے وہ اسکول کالج ملحق ہے، اس سے شکایت کی جاتی، ہم صرف روتے رہے کہ تاریخ کے ساتھ کھلواڑ کیا جاتا ہے، تاریخ کو زعفرانی رنگ میں رنگا جارہا ہے، لیکن ہم نے کبھی مثبت اور صحیح رخ پر کوشش نہیں کی، یہ صرف تاریخ کا مسئلہ نہیں ہے؛ بلکہ ہر شعبہ حیات میں دیکھیے تو یہی معاملہ ہے، اللہ ہم سب پر رحم کرے اور شکوہ شکایت سے اوپر اٹھ کر کچھ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ہندوستان کی آزادی کی کوششیں کئی جہتوں سے ہوئی، بعضوں نے سیاسی پہلو اختیار کیا اور اس اعتبار سے ہندوستان کے حدود میں رہ کر اور یہاں کے قوانین پاسداری کرتے ہوئے سیاست کی، بعضوں نے پرتشدد تحریک چلائی، کچھ نے ملک سے باہر رہ کر انگریزی حکومت کے خلاف سیاسی جدوجہد کی، چند نے ملک سے باہر رہ کر اپنی فوج بنائی اور اس فوج کے دم پر ہندوستان کو انگریزی اقتدار سے آزاد کرنے کا خواب دیکھا، ہر ایک کی نیت اچھی تھی ملک کی آزادی ان کی منزل تھی، یہ اور بات ہے کہ کسی کو منزل ملی اور کوئی راہ میں ہی دم توڑ گیا لیکن محنت اور جدوجہد سبھی نے کی اور سبھوں کی مشترکہ جدوجہد کا دباؤ ہی تھا جو انگریزی حکومت کو اقتدار انتقال کیلئے آمادہ ہونا پڑا، ایسے میں کسی ایک پارٹی کو آزادی کی تحریک کا پورا کریڈٹ دے دینا انصاف کے خلاف اور تاریخی حقائق سے چشم پوشی ہوگی۔

جہاں سبھاش چندر بوس نے جرمنی کی حکومت سے مل کر آزاد ہند فوج کے ذریعہ ملک کو آزاد کرنے کا

---

(۱) ہندوستان کی قومی یکجہتی، ص: ۲۰-۲۱

خواب دیکھا تو وہیں حضرت شیخ الہندؒ نے ملک ہندوستان کے مغربی سرحد پر موجود افغانستان ، یاغستان اورآزادقبائل کی مدد سے ہندوستان پرحملہ اور ہندوستان میں موجود اپنے حمایتیوں کی مدد سے ہندوستان کوآزاد کرانے کی جدوجہد کی ،آج افسوس کی بات یہ ہے کہ سبھاش چندر بوس کا نام ہرجگہ جگمگا رہاہے اورشیخ الہند کا نام اورکام صرف مسلمانوں تک محدود ہوگیاہے، ہندوستان کی سرکاراورحکومت میں اس کاکہیں کوئی ذکرنہیں،تاریخ مسخ کرنے کا یہ بھی ایک طریقہ رہاہے،اس میں کانگریس اور بی جے پی دونوں برابرکی شریک ہیں اورکچھ غلطی ہماری اپنی ہے کہ ہم نے حضرت شیخ الہند کے کارناموں کو بین اقوامی زبانوں میں منتقل نہیں کیا،جس کی وجہ سے غیرجانبدارمورخین بھی ہماری جدوجہد سے ناواقف رہے۔

جلاوطن حکومت کسے کہتے ہیں؟

جلاوطنی سیاست سے مرادقومی حدود سے آزادنسلی جلاوطن افراد کے سیاسی رویے ہیں،جلاوطنوں یا تارکین وطن کے نسلی وطن اورمیزبان ریاست کے ساتھ تعلقات،اورنسلی تنازعات میں ان کا اہم کردار ہے،وکی پیڈیامیں اس تعلق سےلکھا گیاہے:

> جلاوطن ایک قومی حدود سے آزادطبقہ جواپنی مشترکہ شناخت ایک واحدگروہ کے طور پرکرتا ہے۔ یہ دیارغیر کے جلاوطن علاقے دراصل اولین وطن سے تاریخی ہجرت کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں،کسی بھی نقل مکانی اورمخصوص علاقے سے منسلک جلاوطنی کا تاریخی استناد کیا جاسکتا ہے۔آیاواقعی یہ علاقہ اصل میں ایک مخصوص نسلی گروہ کا آبائی ملک ہے یا کہ یہ ایک سیاسی معاملہ ہے۔جتنی نقل مکانی پرانی ہوگی، واقعے کے کم ثبوت ہوں گے: رومانیہ کے لوگوں کی صورت میں نقل مکانی، وطن اورراہ منتقلی کو ابھی تک درست طریقے سے متعین نہیں کیا گیا۔کسی وطنی علاقے کادعوی ہمیشہ سیاسی تعبیر بھی ہوتاہے جواکثرمتنازع رہتاہے۔

جلاوطن سیاست کے فائدے

اول: میزبان ریاستوں میں رہائشی تارکین وطن اپنے سیاسی خانگی اثرکوزیادہ سے زیادہ حدتک منظم کرسکتے ہیں،دوم: تارکین وطن اپنے وطن کے داخلی سیاست کے معاملات میں خاطرخواہ دباؤ ڈال سکتے

ہیں، سوم: تارکین وطن ملکی حدود سے آزاد برادری اپنے وطن اور دیگر ممالک اور بین الاقوامی تنظیموں کے درمیان موثر انداز میں براہ راست ثالثی اور پل کا کردار ادا کر سکتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ'' تارکین وطن کے علاقے ملکی پابندیوں سے آزاد سیاسی اکائیوں کے طور پر سمجھے جاتے ہیں، اپنے تمام لوگوں کی جانب سے سرگرم اور کسی بھی ریاستی (ان کے وطن یا ان کے میزبان ریاستوں) پابندیوں سے آزاد عمل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

جلاوطن حکومت کی اقسام

بنیادی طور پر تین قسم کی جلاوطن حکومتیں پائی جاتی ہیں۔ جن میں سے ایک حکومت وہ ہوتی ہے جس کے دعوے دار درحقیقت اپنے ملک کے سابقہ حکمران ہوتے ہیں، لیکن نئے حکمرانوں کی جانب سے معزول (Deposed Government) کر کے بیرون ملک منتقل کر دیے جاتے ہیں تاہم وہ اپنی معزولی کو نہ مانتے ہوئے خود کو حکمرانی کا قانونی وارث قرار دیتے ہیں اور دوبارہ حکومت حاصل کرنے کی تگ ودو میں لگے رہتے ہیں۔ دوسری جلاوطن حکومتیں وہ ہوتی ہیں جنہیں عوام یا سیاسی رہنماؤں کے وہ گروہ تشکیل دیتے ہیں جو سیاسی یا نظریاتی بنیاد پر اپنی حکومت سے ناراض ہو کر جلاوطن ہو جانے کے بعد ملک سے علیحدگی (Separatist Government) کی تحریک شروع کرتے ہیں اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے جلاوطن حکومت تشکیل دیتے ہیں۔ تیسری قسم کی جلاوطن حکومت ایسے گروہ قائم کرتے ہیں جو عموماً حزب اختلاف سے تعلق رکھتے ہیں اور حکمرانوں کے رویوں سے دلبرداشتہ ہو کر ملک چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ تاہم ان کے حامی سیاست داں اسمبلیوں میں موجود ہوتے ہیں اور اس دوران وہ اپنی جلاوطن قیادت کی رہنمائی میں ایک متوازی حکومت (Alternative Government) بنا کر جدوجہد جاری رکھتے ہیں۔

ماضی قریب اور حال کی جلاوطن حکومتیں

جلاوطن سیاست کی تاریخ بہت پرانی ہے، اگر آپ دیکھیں کہ جب شیر شاہ سوری نے ہمایوں کو لڑائی میں شکست دے دی تو اس نے ایران کا رخ کیا اور وہیں اپنی طاقت کو منظم کرتا رہا اور جب شیر شاہ سوری کی جانشیں کمزور ہوئے تو اس نے دوبارہ ہندوستان میں حکومت قائم کی، یہ جلاوطن سیاست کی ماضی کی ایک مثال ہے، تاریخ میں اس طرح کی سیکڑوں مثالیں ہیں، ہم حال کی چند مثالیں پیش کرتے ہیں:

بدھوں کے فرقے Gelug کے چودھویں دلائی لاما ''تن زن گیاتسو'' (Tenzin Gyatso) تبت پر چین کا غاصبانہ قبضہ قرار دیتے ہیں۔اس اختلاف کے باعث انہوں نے تبت سے باہر اپنی جلاوطن حکومت قائم کی ہے، جس کے وہ سربراہ ہیں،اس جلاوطن حکومت کو مرکزی انتظامی حکومت برائے تبت (CentralTibetan Administration) کہا جاتا ہے،اس حوالے سے ان کا کہنا ہے کہ چین کے زیرِ انتظام تبتی علاقہ درحقیقت ایک تاریخی مقام اور بدھ مت کا مذہبی اور تاریخی ورثہ ہے،جس پر چین نے ۱۹۵۹ء سے قبضہ کیا ہوا ہے۔یہ علاقہ صوبہ چنگ ہی (Qinghai)، گان سو (Gansu)، سی چوان (Sichuan) اور ین نان (Yunnan) صوبوں پر مشتمل ہے۔ان تمام صوبوں کی سرحدیں باہم ملی ہوئی ہیں۔رقبے کے لحاظ سے یہ چاروں صوبے چین کے دس بڑے صوبوں میں شمار کیے جاتے ہیں، جن کا مجموعی رقبہ ۹۶۵۰۰۰ مربع میل بنتا ہے۔چین کی حکومت کی جانب سے علاقے میں اسکولوں اور صحت عامہ کے اداروں کے ساتھ ساتھ سیاحوں کو ترغیب دینے کے لیے مختلف پرکشش سیاحتی اور ثقافتی مراکز بھی قائم کیے گئے ہیں۔اگرچہ ان ترقیاتی منصوبوں سے علاقے میں ترقی کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں تاہم ۷۵ سالہ دلائی لاما کا کہنا ہے کہ تبت کا علاقہ بدھ مت کے لیے عبادت گاہ کا درجہ رکھتا ہے، جب کہ چینی حکومت صرف معاشی فوائد کی خاطر اس وسیع وعریض تاریخی اور مذہبی ورثے کو تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہے۔جدیدیت اور سیاحت کے نام پر تشکیل دیے گئے ان منصوبوں نے تبت کی روایتی اور مذہبی زندگی کو بھی مسخ کر دیا ہے۔چینی حکام دلائی لاما کے موقف کے جواب میں کہتے ہیں کہ پچاس سال قبل چین نے دراصل تبت میں مذہبی لبادے میں چھپے جاگیرداروں اور جاگیری داری نظام کے خلاف کارروائی کر کے ایک جمہوری ماحول پیدا کیا تھا، جس میں وقت کے ساتھ بہتری آتی جارہی ہے۔واضح رہے کہ چین کی جانب سے فوجی کارروائی کے بعد بدھ مت کے روحانی پیشوا ''تن زن گیاتسو' اور ان کے پیروکاروں نے انڈیا منتقل ہو کر جلاوطن حکومت قائم کر لی تھی جس کا ہیڈکوارٹر شمالی انڈیا کی ریاست ہماچل پردیش کے قدیم شہر ''دھرم شالا'' میں ہے۔دلائی لاما ''تن زن گیاتسو' دھرم شالا میں اس وقت سے مقیم ہیں، جب ۲۸/اپریل ۱۹۵۹ء کو دلائی لاما اور ان کے تبتی پیروکاروں کی بغاوت ناکام ہوگئی تھی اور وہ جلاوطن ہونے پر مجبور ہو گئے تھے۔تبتی جلاوطن حکومت (CTA) کے مقاصد میں سرفہرست تبت کو چین کے مبینہ تسلط سے آزادی دلانا اور اپنا مذہبی تشخص بحال کرانا ہے۔واضح رہے کہ جلاوطن حکومت CTA نے ۲۰۰۱ء میں تبت کی تاریخ کے اولین انتخابات بھی کرائے تھے، جس میں جلاوطن تبتی باشندوں نے پروفیسر Samdhong Lobsang Tenzin کو

وزیر اعظم منتخب کیا تھا۔ اس کے علاوہ چھ وزارتیں بھی قائم کی گئی تھیں۔ اگرچہ تبت کی جلاوطن حکومت کو دنیا کے کسی بھی ملک نے تسلیم نہیں کیا ہے، تاہم بھارت کی جانب سے تبتی جلاوطن حکومت کو کافی سہولیات حاصل ہیں۔ ان سہولیات پر چین کی طرف سے سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا جاتا ہے اور اس معاملے پر دونوں ملکوں میں کشیدگی رہتی ہے۔ دلائی لاما اور ان کے پیروکاروں کو یقین ہے کہ وہ عنقریب جلاوطن حکومت کی کوششوں سے تبت کو چین سے آزادی دلانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

۱۹۷۹ء میں اسلامی انقلاب کے بعد ایران سے شہنشاہیت کا بستر گول کر دیا گیا تھا اور اس وقت کے بادشاہ محمد رضا شاہ پہلوی ملک سے فرار ہو کر قاہرہ میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے تھے۔ تاہم رضا شاہ پہلوی مرتے دَم تک خود کو ایران کا شہنشاہ ہی کہلواتے رہے۔ ان کے انتقال کے بعد سے شاہی تاج ان کے سب سے بڑے بیٹے ''محمد رضا پہلوی'' نے اپنے سر پر سجا رکھا ہے اور وہ بھی خود کو شہنشاہ کہلواتے ہیں۔ اپنی اس حیثیت سے دنیا کو آگاہ کرنے کے لیے انہوں نے ایران سے باہر میری لینڈ میں ''پہلوی شہنشاہیت'' کی جلاوطن حکومت قائم کر رکھی ہے اور اس تناظر میں وہ اپنی خط و کتابت میں سابقہ شہنشاہیت کے زمانے کے ایران کا سرکاری نشان اور پرچم استعمال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی اس حیثیت کو استعمال کرتے ہوئے کوشش کی ہے کہ وہ ایران کے سیاسی معاملات پر اثر انداز ہوں۔ کئی مواقع پر انہوں نے ایرانی عوام سے سول نافرمانی کی درخواست کی ہے جبکہ عوام کو گزشتہ سال ہونے والے انتخابی عمل سے بھی دور رہنے کا ''حکم'' دیا تھا۔ اسی طرح پچاس سالہ جلاوطن بادشاہ محمد رضا پہلوی اور ان کی جلاوطن حکومت کی جانب سے ایران میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر بھی تشویش کا اظہار کیا جاتا ہے۔ سیاسیات میں اعلیٰ تعلیم کے حامل محمد رضا پہلوی کا یہ بھی خیال ہے کہ ایران کی آبادی کا دو تہائی حصہ جو تیس سال کی عمر کے نوجوانوں پر مشتمل ہے ان کا زبردست حامی ہے؛ کیونکہ انقلاب ایران کے بعد جوان ہونے والی نسل میں دنیا کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کا جذبہ موجود ہے اور ان نوجوانوں کے ترقی اور جدیدیت کے خواب صرف ان کی حکومت ہی میں شرمندۂ تعبیر ہو سکتے ہیں۔

ایرانی ثقافت کو اپنی شناخت قرار دینے والے محمد رضا پہلوی نے دورانِ تعلیم جیٹ فائٹر کی ٹریننگ بھی حاصل کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جلاوطن ہونے کے باوجود انہوں نے ۱۹۸۰ء میں عراق اور ایران کی جنگ کے آغاز کے وقت جنگ میں شریک ہونے کا ارادہ ظاہر کیا تھا، جسے انقلابی حکومت نے رَد کر دیا تھا۔ اس قسم کے رویے کے باوجود محمد رضا پہلوی کی جلاوطن حکومت ایران کی موجودہ مذہبی حکومت کے خلاف کسی بھی غیر ملکی فوجی

ایکشن کی ہمیشہ مخالفت کرتی رہی ہے۔ محمد رضا پہلوی جو اس وقت امریکا کی ریاست میری لینڈ کے شہر Potomac میں اپنی بیوی اور تین بیٹیوں کے ساتھ رہائش پذیر ہیں، نے ۱۳/اپریل ۲۰۱۰ء کو جارج واشنگٹن یونیورسٹی میں ایک لیکچر دیتے ہوئے ایران کے حالیہ انتخابات پر کڑی تنقید کی تھی اور کہا تھا کہ دنیا عنقریب ایران میں حقیقی جمہوریت کا دوبارہ عروج دیکھے گی۔ ایک ایسا عروج جس میں مذہب کا ریاستی معاملات میں کلیتاً دخل نہیں ہوگا اور یہ تبدیلی ایران کے اندر سے ہی نمودار ہوگی۔ یہی ان کی جلاوطن حکومت کا منشور بھی ہے، جسے پارلیمانی ملوکیت کا قیام کہا جاسکتا ہے۔ تین کتابوں کے مصنف جلاوطن بادشاہ محمد رضا پہلوی کی شہنشاہیت کا دائرہ کار فی الحال انٹرنیٹ، یوٹیوب، بلاگ اور فیس بک تک محدود ہے۔

مولانا عبیداللہ سندھی: مختصر حالات وافکار

ہندوستان کی آزادی میں جن لوگوں نے تن من دھن کی قربانی دی، ان میں ایک نمایاں نام تاریخ کے صفحات میں گم مولانا عبیداللہ سندھیؒ کا ہے، مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی خدمات کا مسلمانوں کی کچھ کتابوں میں تو ذکر ہوتا ہے لیکن سرکاری اور عصری اداروں کی کتابوں میں ان کا ذکر کہیں نہیں آتا، حالانکہ یہ وہ شخصیت تھی جس نے اپنی پوری جوانی آزادی کی نذر کردی، ان کا خواب پاکستان نہیں بلکہ ایک متحدہ ہندوستان تھا جہاں مسلم اکثریتی ریاستوں کو حق خودارادیت حاصل ہو۔

جمعہ کی شب ۱۲/محرم ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۰/مارچ ۱۸۷۲ء آپ پیدا ہوئے، آپ کے والد ہندو تھے لیکن شادی سکھ خاندان میں کی اور سسر کی ترغیب پر وہ بھی سکھ بن گئے، ۱۸۸۷ء میں انہوں نے مسلم ساتھیوں کے اثر اور تحفۃ الہند کے مطالعہ سے اسلام قبول کیا اور گھر بار چھوڑ دیا، حضرت مولانا اسماعیل شہیدؒ کی تقویت الایمان سے ایمان اور شرک کا فرق اچھی طرح جان لیا اور تحفۃ الہند کے مصنف کے نام پر اپنا نام عبیداللہ خود سے رکھ لیا آپ فرماتے ہیں کہ احوال الآخرت کا مطالعہ اور تحفۃ الہند میں نومسلموں کے واقعات نے ہی ان کو قبل از وقت اظہار اسلام پر آمادہ کیا۔

سندھ میں ان کو حضرت حافظ محمد صدیق صاحب کی صحبت نصیب ہوئی جو وقت کے جنید اور سید العارفین تھے، ان کی صحبت میں رہنے سے اسلامی معاشرت اور طرز زندگی ان کیلئے طبیعت ثانیہ بن گئی، حضرت صدیق صاحب نے ان کو اپنی کفالت اور تربیت میں لے لیا اور ایک باپ کی طرح ان کیلئے شفیق ہوگئے، وہیں انہوں نے قادری راشدی خاندان میں بیعت کرلی تھی، وہاں سے مزید تعلیم کیلئے دین پور پہنچے، وہیں ان کی والدہ بھی

ڈھونڈتے ڈھونڈتے پہنچ گئیں اور واپس لے جانے کیلئے بہت زور لگایا؛ لیکن آپ ثابت قدم رہے، ہدایت النحو اور کافیہ پڑھ کر بقیہ تعلیم کیلئے دیوبند آئے، پانچ مہینے میں قطبی تک منطق کے رسائل متفرق اور شرح جامی پڑھی، مطالعہ کا طریقہ سیکھ لیا تو خود سے عربی کتابوں کا مطالعہ کرنے لگے، دیوبند میں دو تین مہینے مولانا حافظ احمد صاحب سے تعلیم حاصل کی، حضرت شیخ الہند کے دروس میں شامل ہوئے اور ۱۳۰۷ھ کو ہدایہ، تلویح، مطول، شرح عقائد، مسلم الثبوت کا امتحان دیا اور امتیازی نمبروں سے پاس ہوئے، مولانا سید احمد دہلوی جوابات دیکھ کر کہنے لگے اگر اس کو کتابیں ملیں تو شاہ عبدالعزیز ثانی ہوگا۔ اس کے بعد تفسیر بیضاوی اور دورہ حدیث میں شریک ہوئے، جامع ترمذی حضرت شیخ الہند سے اور سنن ابوداؤد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے پڑھی، آپ فرماتے ہیں کہ میں نے سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ چار چار دن میں پڑھی ہی اور سراجی دو گھنٹوں میں ختم کی۔

یہاں سے آپ سندھ واپس گئے، سید العارفین کا انتقال ہو چکا تھا، ان کے خلیفہ اور جانشیں نے بڑی محبت کا معاملہ کیا، اور وہیں آپ کی شادی وغیرہ ہوئی، اور آپ کی والدہ بھی آپ کے ساتھ ہی رہنے لگیں، سید العارفین کا بڑا کتب خانہ تھا، اس کے علاوہ پیر جھنڈا شاہ کا کتب خانہ بھی اپنے نوادر اور مخطوطات کیلئے مشہور تھا، آپ نے ان سے پورا استفادہ کیا، یہیں آپ نے تصوف اور سلوک کے مراحل بھی طے کیے۔

پہلے پہل آپ نے حضرت مولانا قاسم نانوتوی کی تصانیف کا گہرائی سے مطالعہ کیا، پھر حضرت شاہ اسماعیل شہید، حضرت مولانا رفیع الدین وغیرہم کی تصانیف کا مطالعہ کیا، جس کی وجہ سے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تصانیف کا سمجھنا آسان ہوگیا، حجۃ اللہ البالغہ کا آپ نے بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا اور اس کو موجودہ سیاسی حالات پر منطبق کرنے اور ایک نئے اسلامی انقلاب کا پروگرام حجۃ اللہ البالغہ سے تیار کیا۔

آپ سکھ تھے، انگریزوں کے ہاتھوں سکھوں کی شکست اور انقلاب پنجاب کے تکلیف دہ حالات گھر کی عورتوں کی زبانی لگاتار سنتے رہتے تھے، آپ کے ایک استاد مولانا عبدالکریم صاحب نے دہلی کی تباہی کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے تھے، اس سے انگریزی حکومت کے خلاف انقلابی جذبہ بیدار ہوا۔ ۱۳۱۵ میں دیوبند پہنچے اور اپنا انقلابی پروگرام ان کی خدمت میں پیش کیا، حضرت شیخ الہند نے بعض ترمیمات کے ساتھ ان کے انقلابی پروگرام کو پسند کیا۔ آپ واپس سندھ آے اور اپنا مطبع قائم کیا اور ماہوار رسالہ ہدایت الاخوان نکالا لیکن یہ چلا نہیں، پھر ایک مدرسہ قائم کیا اور سات سال تک علمی وانتظامی مکمل اختیارات کے ساتھ وہاں رہے، ۱۳۲۷ میں حضرت شیخ الہند نے دیوبند طلب کیا، اور چار سال تک جمعیۃ الانصار میں کام کیا، پھر اس جمعیۃ

الانصار کو نظارۃ المعارف کا نام دے کر دیو بند سے دہلی منتقل کر دیا گیا، دہلی میں آپ کو بڑے سیاسی لوگوں سے ملاقات کے مواقع حضرت شیخ الہند نے میسر فرمائے، جن میں حکیم اجمل خان، اورنواب وقارالملک شامل تھے، اوراسی طرح معاصرین میں ڈاکٹر انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد، اورمولانا محمد علی جوہر وغیرہم سے ملاقات ہوئی، دوسال نظارۃ المعارف کے تحت کام کرنے اورقدیم وجدید تعلیم یافتہ افراد میں خلیج کو دور کرنے کے بعد ۱۳۳۳ھ میں شیخ الہند نے ان کو کابل جانے کا حکم دیا، کابل جانے کا ان کا ارادہ نہیں تھا لیکن حضرت شیخ الہندؒ کے حکم پر باوجود بارخاطر ہونے کے وہ چلے گئے، وہاں چل کر ان کو پتہ چلا کہ شیخ الہند کی طویل محنت کا ثمر وہاں موجود ہے۔

کابل میں آپ سات سال رہے، وہاں آپ نے اقتدار کی غلام گردشوں میں مفادات کی بنیاد پر بدلتی سیاسی وفاداریاں دیکھیں، مذہب کو محض ایک چارہ کے طوپر استعمال ہوتے دیکھا، سات سال کابل میں رہے، پھرآپ ماسکوتشریف لے گئے، وہاں آپ نے کمیونسٹ نظام اورکمیونزم کا گہرا مطالعہ کیا، اس بارے میں انگریزی جاننے والے رفقاء سے بھی بھرپور مدد لی، ماسکو میں آپ تقریبا سات ماہ یااس سے کچھ زیادہ رہے، ماسکو سے آپ ترکی گئے، ترکی میں بھی آپ نے وہاں کی سیاسی حالت کا پوری گہرائی سے مشاہدہ اورتجزیہ کیا اوراس نتیجہ پر پہنچے کہ اسلام کی بنیاد پر اتحاد کا خواب موجودہ حالات میں ممکن نہیں ہے، ترکی میں تین سال گزارنے کے بعدحرمین شریفین تشریف لے گئے، تقریباً بارہ سال وہاں قیام رہا، ترکی میں ہی جب آپ پان اسلام ازم سے مایوس ہوگئے یعنی اسلام کی بنیاد پر مسلم ممالک میں اتحاد تو آپ نے اپنی پوری توجہ مطالعہ میں لگادی، بالخصوص حضرت شاہ ولی اللہ کے سیاسی اوراقتصادی نظام کے فلسفہ میں، وہیں آپ نے یہ بھی سوچا کہ شاہ ولی اللہ کے ذکرکردہ سیاسی نظام کو موجودہ حالات پر کیسے منطبق کیا جاسکتا ہے؟ آپ تقریباً بارہ سال حرم کے جوار میں رہے، اورمطالعہ وفکرہی واحد مشغلہ تھا، جب ایک سیاسی نظام اورفلسفہ ترتیب دے لیا تو پھر وطن واپسی کا سوچا، حرم شریف سے مفارقت آسان نہیں تھی اورکس مسلمان کو حرم سے واپسی گوارا ہوتی ہے؛ لیکن آخرہ وہ کیا چیز تھی جس کیلئے صحابہ اورتابعین نے مکہ مدینہ چھوڑ کر دنیا کے دور دراز کے حصوں میں پہنچنااوروہیں مرنا گوارا کیا، اسی احساس نے حضرت مولانا سندھی کو بھی بے چین کردیا، آپ اس بارے میں لکھتے ہیں:

> محض وطن اورخاندان کی محبت مجھے اس عمر میں ہندوستان کھینچ کر نہیں لائی، میں
> اب بوڑھا ہو چکا ہوں، زندگی کے معلوم نہیں کتنے دن اورہیں، مجھے اگرآرام اور

سکون کی خواہش ہوتی تو عمر کے یہ آخری دن حرم پاک ہی میں اطمینان سے گزارتا، اوراس مقدس سرزمین میں سپرد خاک ہونا پسند کرتا، میں اس بڑھاپے میں اوراس قدر ضعف اور کمزوری کے باوجود آپ لوگوں کے پاس اس لیے پہنچا ہوں کہ کیونکہ مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے، آپ کے بزرگوں نے مجھے باہر بھیجا تھا، باہر رہ کر جو کچھ بھی اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کرسکتا تھا میں نے کیا— میری خوش قسمتی تھی کہ جلاوطنی کے آخری ایا میں توفیق الٰہی دیارحرم میں لے آئی اور وہاں تقریباً ۱۲ سال تک رہا، اس طویل مدت میں مجھے اپنے تجربات ،تاثرات ،اور جو کچھ اس وقت تک دیکھا، پڑھا اور سنا تھا، ان پر یکسوئی سے غور کرنے کا موقع ملا، آپ لوگ یقین کریں کہ جہاں تک میری عقل اور سمجھ کی پہنچ تھی، میں نے اپنے افکارکواس طویل مدت میں خوب جانچا، پرکھااوران کے حسن وقبح میں تمیز کی، میں نے اپنے افکار کو جتنی بھی تاریخ میں جانتا تھا، اس کسوٹی پر کسا، خوداپنے تجربات کی روشنی میں ان کی صوابدید کی اور جو کچھ علم دین، حکمت اور تقوی مجھے میسر تھااوراپنے مرشدوں اوراستاذوں کے فیض سے جو بھی بصیرت عطا ہوئی تھی، اپنے افکارکوان کے روبرو پیش کرکے اپنے نفس کا بھی محاسبہ کیا اوران کے افکار کا بھی پورا جائزہ لیا— چنانچہ حرم اقدس کی برکتوں اوررحمتوں سے بھری ہوئی سرزمین میں ایک طویل عرصہ تک غور وتامل کرنے کے بعد جب مجھے اس بات پر پورااطمینان ہوگیا کہ جن افکاروخیالات اورطریق کار کی طرف میری جستجو نے میری راہنمائی کی ہے، اس سے نہ تو خدانخواستہ میرے اسلام کو گزند پہنچے گی اور نہ میری قوم کواس کی وجہ سے کسی نقصان کا اندیشہ ہے— جب مجھے اس حقیقت پر پورا یقین حاصل ہوگیااوراس نے کچھ کرنے اورفکرکوعمل میں لانے پر مجبور کردیا تو میں نے وطن واپس آنے کا تہیہ کرلیا، بے شک مجھے واپس وطن آنے کیلئے اپنے دشمنوں (انگریزی گورنمنٹ سے وطن واپسی کی درخواست) کے سامنے جھکنا پڑا، لیکن میں نے اپنی طبیعت کے خلاف اس

اعتراف شکست کے صدمے کو برداشت کیا، کیونکہ اگر ایسا نہ کرتا تو کبھی بھی آپ لوگوں سے آج یوں باتیں نہ کرسکتا، جو کچھ میرے دل ودماغ میں تھا، اسے میں ایک سربستہ راز کی طرح اپنے ساتھ قبر میں لے جاتا اور آپ لوگوں کو ان حقائق سے آشنا نہ کرپاتا جن تک خدامعلوم کیسی جسمانی مشقتوں، دماغی کاوشوں اور جان کاہیوں کے بعد پہنچا تھا، جن میں میرے خیال میں آپ لوگوں کیلئے دنیا وآخرت دونوں کی فلاح تھی۔(۱)

شیخ الہند نے مولانا سندھیؒ کو کابل کیوں بھیجا، اس کے بارے میں حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ لکھتے ہیں کہ یاغستان میں مجاہدین کی جماعت جو حاجی زئی کی سربراہی میں لڑرہی تھی انہوں نے ہتھیاروں اور رسد کی قلت کی شکایت کی:

بحمداللہ ہمارے پاس بہادر آدمیوں کی کمی نہیں ہے، مگر اسلحہ اور رسد کے بغیر ہم بالکل بے دست وپا ہیں، ساتھ کی لائی ہوئی روٹیوں کے ختم ہوجانے پر مجاہد بے ہتھیار ہوجاتا ہے، اگر کارتوس اور رسد کافی تعداد میں ہوتو توپوں اور مشین گنوں، ٹینکوں وغیرہ کا ہم بخوبی مقابلہ کرسکتے ہیں، آپ جلد از جلد کسی حکومت کو ہماری پشت پناہی کیلئے تیار کیجئے، الغرض اس امر کی بناء پر حضرت شیخ الہند کا ارادہ بدلا، مولانا عبیداللہ صاحب کو کابل اور خود کو استنبول پہنچانا ضروری قرار دیا۔

چونکہ یہ حضرت شیخ الہند کی تحریک اور خدمات پر مضمون نہیں ہے بلکہ ہندوستان کے باہر ہندوستان کی قائم کردہ جلاوطن حکومت اور اس میں حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی خدمات مقصود ہیں، اس لیے حضرت شیخ الہندؒ کی خدمات جلیلہ کو پھر کسی وقت کیلئے رکھ کر اصل مقصد پر آتے ہیں، جلاوطن حکومت کے بارے میں مشہور صحافی شورش کاشمیری کے اخبار چٹان میں ایک تحریر شائع ہوئی تھی، اسی تحریر کو ہم یہاں نقل کرتے ہیں، یہ تحریر طوالت کے باوجود جلاوطن حکومت کے خدوخال کو سمجھنے کیلئے بڑی اہم ہے۔

---

(۱) ذاتی ڈائری، ص: ۱۰۲ تا ۱۰۴

جلاوطن حکومت، ایک نظر میں

جنگ کے شعلے ہر طرف پھیل رہے تھے، ہندوستان کے انقلابی نوجوان خفیہ راستوں سے جرمنی، ترکی، ایران اور افغانستان پہنچے، ان نوجوانوں میں مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا برکت اللہ، مسٹر محمد علی، راجہ مہندر پرتاپ، صوفی امبا پرشاد، اللہ نواز خان ملتانی، مسٹر ہردیال پرشاد، مسز سروجنی نائیڈو کے بھائی چٹو پادھیائے وغیرہ۔ راجہ مہندر پرتاپ اور مولانا برکت اللہ برلن میں قیصر ولیم سے ملے اور ہندوستان کو آزاد کرانے کے سلسلے میں ایک جامع منصوبہ تیار کیا گیا، اس منصوبہ پر ہندوستانی انقلاب پسندوں اور جرمن افسروں نے کئی روز تک غور وخوض کیا اور یہ جب منصوبہ ترمیم وایزاد کے ساتھ منظور کرلیا گیا تو راجہ مہندر پرتاپ مولوی برکت اللہ اور دوسرے جرمن افسر برلن سے ترکی پہنچے اور ہندوستانی انقلاب پسندوں نے غازی انور پاشاہ اور سلطان ترکی سے طویل ملاقاتیں کیں، چنانچہ ایک وفد ترتیب دیا گیا، جس میں راجہ مہندر پرتاپ، مولانا برکت اللہ، ڈاکٹر فان ہنٹنگ، کیپٹن بینڈونیز اور کیپٹن قاسم بے شامل تھے، یہ وفد سلطان ترکی، قیصر جرنی اور جرمن چانسلر کے خطوط لے کر کابل کی طرف روانہ ہوا، خفیہ راستوں سے یہ لوگ ہرات پہنچے، ہرات میں افغان گورنر نے اس وفد کا شاہانہ استقبال کیا، افغان فوج کے ایک دستے نے ترک کرنیل کی کمان میں ارکان کو گارڈ آف آنر پیش کیا، اس کے بعد وفد نے ہرات کی مساجد، اور دوسرے تاریخی مقامات کو دیکھا، ہرات میں ایک دو روز قیام کرنے کے بعد یہ وفد افغانی فوجی افسروں کی رہنمائی میں گھوڑوں پر سوار ہوکر ہزارہ کی پہاڑیوں کے دشوارگزار راستوں کو طے کرتا ہوا ۲ /اکتوبر ۱۹۱۵ء کو کابل پہنچا، کابل میں ارکان وفد کو افغان فوج نے سلامی دی، اور وفد کو حکومت افغانستان کی طرف سے بابر باغ کے شاہی مہمانے خانے میں ٹھہرایا گیا، مہمان خانے میں تمام انتظامات نہایت عمدہ اور آرام دہ تھے۔

ارکان وفد کو جس سرکاری مہمان خانے میں رکھا گیا، یہ قیام گاہ قدرتی مناظر کے اعتبار سے نہایت حسین وجمیل تھی، مہمان خانے کے سامنے سرسبز وشاداب وادیاں تھیں، مہمان خانہ کے کمروں کے باہر انگور عشق پیچاں کی بیلیں پھیلی ہوئی تھی، ارکان وفد کی خاطر تواضع کے تمام انتظامات موجود تھے؛ لیکن ارکان وفد کو باغ سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی، اوران کی کڑی نگرانی کی جارہی تھی، علاج ومعالجہ کے لیے ایک ترک ڈاکٹر منیر بے مقرر تھے، انقلابی وفد کو تمام اطلاعات ڈاکٹر منیر بے کی وساطت سے پہنچتی رہتی تھی، دو ماہ تک انقلابی وفد کے ارکان اس مہمان خانے میں ایک نظر بند کی حیثیت سے رہے؛ لیکن دو ماہ کے بعد ایک روز راجہ مہندر پرتاپ

کے احتجاج کرنے پر شاہ افغانستان امیر حبیب اللہ خان سے ارکان وفد کی ملاقات کا انتظام کیا گیا، شاہ افغانستان امیر حبیب اللہ خان نے اپنے گرمائی محل میں ارکان وفد کو شرف باریابی بخشا، ملاقات کے وقت وزیر اعظم افغانستان سردار نصر اللہ خان، ولی عہد شہزادہ عنایت اللہ خان اور شہزادہ امان اللہ خان موجود تھے، شاہ کے سامنے کی کرسیوں پر راجہ مہندر پرتاپ، ڈاکٹر فان ہنٹنگ، کیپٹن بینڈونیز، ترک کیپٹن قاسم بے اور مولانا برکت اللہ بیٹھے تھے، دوسری طرف مرکزی نشست پر امیر حبیب اللہ خان کے پہلو میں وزیر اعظم افغانستان سردار محمد نصر اللہ اور دوسرے پہلو میں شہزادہ عنایت اللہ خان، شہزادہ امان اللہ خان اور سردار محمد عزیز خان بیٹھے، انقلابی وفد کی قیادت راجہ مہندر پرتاپ کررہے تھے، انہوں نے قیصر ولیم اور سلطان ترکی کے مکتوبات گرامی شاہ افغانستان کی خدمت میں پیش کیے، اسکے بعد ڈاکٹر فان ہنٹنگ نے جرمن چانسلر کا خط شاہ کی خدمت میں پیش کیا۔

دوپہر تک بات چیت کا سلسلہ جاری رہا، شاہ افغانستان نے انقلابی پارٹی کے منصوبہ سے متعلق تفصیلات دریافت کیں اور پوچھا کہ اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کیلئے راجہ مہندر پرتاپ اور ڈاکٹر فان ہنٹنگ کے ترجمان کے فرائض ادا کررہے تھے، گفت وشنید کا سلسلہ صبح کے وقت شروع ہوا تھا اور دوپہر کے کھانے تک جاری رہا۔

اس دوران بہت سے آزادی پسند ہندو سکھ اور مسلمان طالب علم اور قومی کارکن ہندوستان سے بھاگ کر افغانستان پہنچ چکے تھے، ان میں اجیت سنگھ، عبیداللہ سندھی، محمد علی وغیرہ شامل تھے، افغان حکومت نے ان سب کو قید کررکھا تھا، انقلابی وفد کو جب اس کی اطلاع ملی تو مولانا برکت اللہ اور راجہ مہندر پرتاپ نے افغان حکومت نے سے ان نوجوانوں کی رہائی کا مطالبہ کیا، راجہ مہندر پرتاپ اور مولانا برکت اللہ کے شہزادہ امان اللہ خان اور شہزادہ عنایت اللہ خان ولی عہد سلطنت سے نہایت گہرے تعلقات تھے، چنانچہ ان کی کوششوں سے مولانا عبیداللہ سندھی اور دوسرے تمام ہندوستانیوں کو رہا کردیا گیا، یہ سب لوگ انقلابی وفد کی قیام گاہ پر ہی آگئے اور اب بڑی سنجیدگی سے ہندوستان کو آزاد کرانے کیلئے سرگرمیوں کا آغاز کرنے پر غور ہونے لگا۔ پہلی ملاقات کے بعد شاہ افغانستان نے انقلابی وفد کے ارکان کو الگ الگ گفت وشنید کیلئے طلب کیا، پہلے روز راجہ مہندر پرتاپ اور مولانا برکت اللہ، امیر حبیب اللہ خان سے ملاقات کرنے کیلئے شاہی محل میں پہنچے، شاہ افغانستان اور ہندوستانی لیڈران کے درمیان گفت وشنید کا سلسلہ تین ساڑھے تین گھنٹے تک جاری رہا، اس ملاقات میں بہت سے اہم مسائل پر غور کیا گیا، جن میں ہندوستان کی متوازی حکومت قائم کرنے کا سوال بھی شامل تھا۔

دوسرے روز انقلابی وفد کے جرمن ارکان ڈاکٹر فان ہنٹنگ ارفان ہینڈ ونیز نے شاہ سے ملاقات کی اوراس امر کا یقین دلایا کہ افغانستان میں جو متوازی انڈین گورنمنٹ قائم ہوگی، قیصر جرمنی کی حکومت نہ صرف اسے تسلیم کرے گی بلکہ اس کی اسلحے اور سرمایہ کے ذریعہ مدد بھی کرے گی، اگر ان حالات میں ہندوستان کی برطانوی حکومت کی طرف سے افغانستان پر کوئی حملہ ہوا تو جرمنی اور ترکی دونوں افغانستان کی مدد کریں گے۔

تیسرے روز ترک نمائندے کیپٹن قاسم بے نے شاہ سے تنہا ملاقات کی، یہ ملاقات کئی گھنٹے تک جاری رہی، اوراس ملاقات میں تمام مسائل اور ان کے نتائج پر غور وخوض ہوتا رہا، چنانچہ ان ملاقاتوں کے بعد حکومت افغانستان کی طرف سے وزیر اعظم افغانستان سردار نصراللہ خان نے اپنے معتمد خاص اقائے عبدالرزاق کو وفد کا مشیر اعلیٰ مقرر کردیا، اس کے بعد انقلابی کونسل کے تمام اجلاس آقائے عبدالرزاق خان کے دولت کدہ پر منعقد ہوئے۔انقلابی کونسل کا آخری ہنگامی اجلاس ۲۹/اکتوبر ۱۹۱۵ کو آقائے عبدالرزاق خان کے دولت کدہ پر منعقد ہوا، جس میں ہندوستان کی متوازی حکومت قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا، حکومت افغانستان کی طرف سے بعض سرکاری عمارات کو اس متوازی حکومت کے دفاتر کیلئے مخصوص کردیا گیا، یکم دسمبر ۱۹۱۵ء کو متوازی حکومت کے قیام کا اعلان کردیا گیا، جس پر راجہ مہندر پرتاپ کے دستخط بحیثیت صدر ثبت تھے۔

متوازی حکومت میں راجہ مہندر پرتاپ کو تاحیات صدر منتخب کیا گیا، مولانا برکت اللہ کو وزیر اعظم اور مولانا عبیداللہ سندھی کو وزارت داخلہ سونپی گئی، کیپٹن قاسم بے کو عارضی طور پر وزیر دفاع مقرر کیا گیا اور بہت سے ہندوستانی طلبہ جو افغانستان میں موجود تھے، اس حکومت میں سکریٹری مقرر ہوئے، دو سکھ نوجوان جن پر ہندوستان میں بم کیس چل رہا تھا، وہ بھاگ کر کابل پہنچ گئے تھے لیکن حکومت افغانستان نے ان دونوں کو گرفتار کرکے جیل میں بند کردیا تھا، متوازی حکومت نے سب سے پہلے انہیں رہا کرایا، مسٹر محمد علی کو متوازی حکومت کا سکریٹری جنرل مقرر کیا گیا، تمام خارجہ امور بھی بعد میں ان کے سپرد کردیے گئے، محمد علی خان نے ترکی، ایران، افغانستان اور جرمن حکومت سے استدعا کی کہ متوازی حکومت کو تسلیم کرلیا جائے، متوازی حکومت کے صدر راجہ مہندر پرتاپ کے سکریٹری اقائے اللہ نواز خان تھے، اللہ نواز خان ملتان کے رہنے والے تھے، بعد میں انہوں نے افغانی شہریت اختیار کرلی تھی اور افغان حکومت میں اہم عہدوں پر فائز رہے، وہ مختلف ممالک میں افغانستان کے سفیر رہے، وہ امان اللہ خان اور اس کے بعد نادر خان کے دور حکومت میں بھی افغانستان کی وزارت میں شامل رہے، اس متوازی حکومت نے ہندوستان کی انقلابی جماعتوں خلافت اور کانگریس کے

رہنماؤں سے تعلقات استوار کیے، جب اعلیٰ حضرت شاہ امان اللہ خان نے افغانستان کے تخت وتاج پر قبضہ کرنے کے بعد جرنیل نادر خان کی قیادت میں افغان فوجوں کے ذریعہ ٹل کے مقام پر برطانوی فوج کو شکست دے کر افغانستان کی مکمل آزادی کا اعلان کیا، برطانوی حکومت کی سیات وقیادت تسلیم کرنے سے انکار کردیا، تو ہندوستان کے متوازی حکومت کے وزداخلہ اس وقت عبیداللہ سندھی تھے، اور جس افغان فوج نے ٹل کے مقام پر انگریزی فوجوں کو شکست دی تھی، اس میں بھی ہندوستان کی متوازی انقلابی حکومت کے ارکان اور انقلابی جوانوں نے شرکت کی۔

تحریک خلافت میں جو مسلمان ہجرت کر کے افغانستان پہنچے، ان میں امرتسر کے عزیز ہندی، غلام محمد ترک، ایم اے مجید، فضل الٰہی قربان، سلطان احمد، علامہ حسین میر کاشمیری، مولانا احمد علی، مولانا خدا بخش، مولانا سردار محمد، شوکت عثمانی، مظفر احمد، ابوالوارث، شمس الہدی، فیروز الدین منصور اور بے شمار دوسرے نوجوان شامل تھے، ان نوجوانوں نے مولانا عبیداللہ سندھی پر جو متوازی حکومت کے سربراہ تھے، زور دیا کہ افغان حکومت پر زور دیں کہ وہ ہندوستانی نوجوانوں کو اسلحہ مہیا کرے اور ہندوستان پر حملہ کرنے کی اجازت دے، لیکن افغان حکومت نے اس بات کو تسلیم نہ کیا، کیونکہ اس طرح افغانستان اور برطانیہ میں دوبارہ جنگ چھڑ جانے کا خطرہ تھا اور افغان حکومت دوبارہ جنگ چھڑ جانے کی پوزیشن میں نہیں تھی، ایک وجہ یہ بھی تھی کہ افغان حکومت کو ہندوستانی مسلمان مہاجروں پر اعتماد نہیں تھا، اس کو یہ اطلاعات پہنچ چکی تھی کہ مہاجروں میں سیکڑوں ایسے ہیں جو انگریزوں کے جاسوس ہیں، اور خان عبدالعزیز جو بعد میں پنجاب پولس برانچ کے سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے، سے ان جاسوسوں کا براہ راست تعلق تھا اور یہ لوگ خان عبدالعزیز خان کو افغانستان میں انقلابی نوجوانوں کی سرگرمیوں سے باخبر رکھتے تھے، چنانچہ حکومت افغانستان کے اس رویہ کی وجہ سے بہت سے مہاجر بددل ہوکر واپس ہندوستان وانہ ہوگئے، عزیز ہندی اور صوفی غلام محمد ترک بعض دوسرے مسلمان نوجوانوں کے ساتھ افغانستان میں ہی رہے، ہندوستان کی متوازی حکومت نے سوویت روس کی حکومت سے براہ راست تعلقات قائم کرلیے، راجہ مہندر پرتاپ اور دوسرے ارکان ماسکو چلے گئے اور اس طرح ہندوستان کی تحریک ایک نئے موڑ میں داخل ہوگئی، ہندوستان کی انقلابی اور سیاسی تحریک کو تقویت پہنچانے کیلئے متوازی حکومت نے کرنل عزیز ہندی اور صوفی غلام محمد ترک کو مقرر کیا کہ وہ ہندوستانی انقلاب پسندوں سے براہ راست تعلق قائم کریں، چنانچہ پشاورم میں کامریڈ امیر چند گپتا سے تعلقات قائم کیے گئے، صوفی غلام محمد ترک متوازی حکومت کی طرف

سے پیغامات لے کر پشاور پہنچے اورصوفی ترک کے ذریعہ ہی ہندوستانی انقلاب پسندوں کو مالی مدد پہنچائی جاتی تھی،صوفی غلام محمد ترک بھیس بدل کر امرت سر، انبالہ اور دہلی تک پہنچے اور ہندوستانی انقلاب پسندوں کے جوابی پیغامات لے کر واپس کابل پہنچ جاتے، امیر چند گپتا ہندوستان اور افغانستان کے انقلاب پسندوں کے مابین رابطہ افسر کی حیثیت رکھتے تھے، افغانستان میں انقلاب آیا، شاہ امان اللہ خان کی حکومت کا تختہ الٹ گیا، بچہ سقہ انگریزوں کی سازش سے افغانستان کی حکومت پر قابض ہوگیا، بچہ سقہ کے دور حکومت میں جہاں شاہ امان اللہ کے بہت سے حامیوں کو گرفتار کر کے گولی کا نشانہ بنادیا گیا، یا توپ دم کر دیا گیا، وہاں بہت سے لوگوں کو جن میں کرنل عزیز ہندی اور صوفی غلام محمد ترک بھی شامل تھے، گرفتار کر کے قید کرلیا گیا، انقلابی متوازی حکومت کے ارکان کابل سے ماسکو، انقرہ اور برلن چلے گئے، اس طرح متوازی حکومت جس کے صدر راجہ مہندر پرتاپ، وزیر اعظم مولانا برکت اللہ اور وزیر داخلہ مولانا عبیداللہ سندھی تھے، اس کا خاتمہ ہوگیا۔

برصغیر ہندو پاک کی جدوجہد آزادی کا یہ درخشندہ وتابندہ باب ہے، جس کا ایک ایک لفظ آزادی کی جدوجہد میں مسلمانوں کی تابندہ اور درخشندہ قربانیوں کا آئینہ دار ہے؛ لیکن اس کے باوجود کانگریس نے مسلمانوں کو ہمیشہ رجعت پسند قرار دیا، برصغیر کی آزادی کی جدوجہد میں مسلمانوں نے ہندوؤں سے کسی طرح بھی کم قربانیاں نہیں دی ہیں، بلکہ اپنے تناسب آبادی سے چار گنا زیادہ قربانیاں دی ہیں، کوئی بھی غیر جانبدار مورخ مسلمانوں کی ان عظیم قربانیوں کو نظر انداز نہیں کر سکے گا، ہندو مورخین تنگ دلی اور تعصب کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسلمانوں کو بدنام کرنے کی لاکھ کوشش کریں، لیکن تاریخ وجدوجہد آزادی ہند کے ان عدیم النظیر کارناموں پر پردہ دالنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکیں گے۔(۱)

حضرت مولانا عبیداللہ سندھی نے بحیثیت وزیر داخلہ حکومت موقتہ ہند جو خط ہندوستانی مسلمانوں کے نام جاری کیا تھا، یہ ہندوستانی مسلمانوں کے ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستانیوں کے نام تھے، ذیل میں اس کو بطور حکومت موقتہ ہند کے ایک تبرک کی حیثیت سے پیش کیا جارہا ہے:

حکومت موقتہ ہند میں وزیر داخلہ کی حیثیت سے مولانا عبیداللہ سندھی کا

ہندوستانی قوم کے نام خط:

حکومت موقتہ ہند، نظارت داخلہ!

(۱) چٹان ۲۱ ستمبر ۱۹۶۴ء، تذکرہ حضرت شیخ الہند، مفتی عزیزالرحمن، ص ۲۱۳ تا ۲۲۳

عارضی حکومت ہند کی خبر رولٹ سیڈیشن کمیٹی کی رپورٹ میں پڑھ چکے ہو، یہ حکومت اس لیے بنائی گئی ہے کہ ہند میں موجود غاصب، غدار ظالم حکومت کے عوض بہترین حکومت قائم ہو، تمہاری عارضی حکومت چار سال سے مسلسل جدوجہد کر رہی ہے، اس وقت جب تم نے ظالمانہ قانون کے نہ ماننے کا پکا ارادہ کرلیا، عین اسی زمانہ میں حکومت موقتہ بھی امداد حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی، حملہ آور فوجوں سے حکومت موقتہ ہند نے معاہدہ کرلیا ہے، اس لیے اس سے مقابلہ کر کے اپنے حقیقی فوائد ضائع نہ کریں، بلکہ انگریزوں کو ہر ممکن طریقہ سے قتل کریں، انہیں آدمی اور روپے کی مدد نہ دیں، ریل اور تار خراب کرتے رہیں، حملہ آور فوج سے امن حاصل کرلیں، ان کو رسد اور سامان سے مدد دے کر اعزازی سندیں حاصل کریں، حملہ آور فوج ہر ہندوستانی کو بلاتفریق نسل ومذہب امن دیتی ہے، ہر ایک ہندوستانی کی جان، مال عزت محفوظ ہے، فقط وہی مارا جائے گا یا بے عزت ہوگا جو مقابلہ میں کھڑا ہوگا، خدا ہمارے بھائیوں کو سیدھے راستہ پر چلنے کی توفیق دے۔

(عبیداللہ، وزیر حکومت موقتہ ہند) (ظفر حسن، سکریٹری حکومت موقتہ ہند)

حضرت مولانا سندھی نے اپنی خود نوشت میں اس جلاوطن حکومت کے طرز عمل، طریقہ کار اور متعدد امور پر روشنی ڈالی ہے، مناسب ہے کہ ہم اس کا یہاں ذکر کریں، اولاً تو یہ بات ایک انکشاف کا درجہ رکھتی ہے کہ ہندوستان کے ہندو سیاست دانوں کو اس کی بھنک لگ چکی تھی کہ مسلمان غیر مسلم ممالک سے امداد لے کر حکومت ہند پر چڑھائی کرنا چاہتے ہیں، وہ جانتے تھے کہ اگر ایسی صورت حال ہوئی تو ہندوستان میں پھر سے مسلم حکومت قائم ہو جائے گی، اس کی پیش بندی ہی کیلئے راجہ مہندر پرتاپ اور دیگر کو مشہور ہندو لیڈر مدن موہن مالوی نے مقرر کیا تھا کہ اگر کبھی کوئی فوجی اتحاد بنے اور اس میں افغانستانی حکومت شامل ہو تو اس کے برابر حصہ شاہ نیپال کا بھی ہو، اس وقت نیپال دنیا میں واحد ہندو حکومت تھی، اس بارے میں مولانا عبیداللہ سندھی لکھتے ہیں:

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، فقط اس قدر تھا کہ جرمنی ترکی اتحاد میں اگر افغانستان شمولیت کا قصد کرے تو مالوی جی کا ایک نمائندہ اس سے واقف ہوتا رہے،

اور جہاں تک ممکن ہو، ہندوستان کی سرحد سے اس مصیبت کو ٹالتا رہے، معاملات میں جو پوزیشن شاہ افغانستان کو حاصل ہو، اس میں مہاراجہ نیپال کو شریک کرنے کی کوشش کرے،—انڈین سوسائٹی برلن نے پوری دانش مندی سے اس ہندو تحریک کو سارے ہندوستان کا رنگ دینے کیلئے مولانا برکت اللہ صاحب کو بھی برائے نام اس میں شریک کیا۔ مولانا برکت اللہ صاحب مرحوم کی شمولیت کو جس قدر ہم بے معنی دکھلا رہے ہیں اس کا مولانا کی شخصیت سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ یہ مسلمانوں کی اس غفلت کی سزا ہے جو اپنے آپ کو اقلیت میں فرض کرکے اکثریت کے رحم پر زندگی بسر کرتے ہیں، جب ایک شخص کے ذہن میں یہ ٹھونس دیا جائے کہ تم اس بت کدہ کے اجازت نہ ہونے کی صورت میں کوئی کام نہیں کر سکتے تو اس شخص کے بے کار ہونے میں کیا کلام ہوسکتا ہے، اس کی ایک دو مثالیں، مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام آزاد جب اپنا اختیار مہاتما گاندھی کے سپرد کرتے ہیں تو کیا وہ اپنی قربانیوں سے مستفید ہوسکتے ہیں، یا ڈاکٹر انصاری اگر سوامی شردھانند کے ساتھ وابستہ کردیا جائے تو اس کی محنت کوئی نتیجہ دے سکتی ہے، اسی طرح اگر مولانا برکت اللہ مرحوم راجہ صاحب سے اختلاف کرکے اپنا کام جاری نہیں رکھ سکتے تو ان کی ہاں میں ہاں ملانے کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔(۱)

اس اقتباس سے واضح ہے کہ جس جلاوطن حکومت کا تاحیات صدر راجہ مہندر پرتاپ کو بنایا گیا، اس کا مقصد کیا تھا اور اس کا سرا کہاں تھا، مولانا عبیداللہ سندھی نے اس مشن کا جائزہ لیا جو دنیا بھر میں گھوم پھر کر کام کر رہی تھی اور انگریزی حکومت کے خلاف جدوجہد کر رہی تھی تو آپ نے پایا:

تمام یوروپ اور امریکہ میں یہ پروپیگنڈا پھیل چکا ہے کہ مسلمان ہندوستان میں اقلیت میں ہیں اور ان کی کوئی ہستی نہیں، نہ ان میں تحریک آزادی ہے اور نہ طاقت انقلاب، اور دوسرا یہ ہے کہ ہمارے ہندو بھائی جب ہندوستان کا تعارف

(۱) ذاتی ڈائری، ۴۷

کراتے ہیں تو یہ بھی بتادیتے ہیں کہ ہندوستانی ملاقات کے وقت رام رام کیا کرتے ہیں خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، چنانچہ جب میری ملاقات جرمن کیپٹن سے ہوئی تو اس نے اٹھ کر سلام کے بجائے رام رام کیا۔(۱)

راجہ مہندر پرتاپ سنگھ کے بارے میں مولانا سندھی لکھتے ہیں:

ہمارے راجہ صاحب ہیومن ٹیرین (انسانیت پرست) ہیں اور اسی کا پروپیگنڈہ کرتے ہیں لیکن اعلیٰ انسانیت کا معیار ان کے ذہن میں ایک کٹر سیاسی سے اونچا نہیں ہے، ان کے نزدیک ہندوستان میں مسلمانوں کی کوئی ہستی نہیں تھی، یہ کہنا بے جا نہیں ہے کہ میرے تبادلہ خیالات نے راجہ صاحب کو مجبور کیا کہ ہندوستانی معاملات میں وہ صحیح طور پر مسلمانوں کو شریک کریں، اور میں ان کیلئے ایسا نرم اور میٹھا ثابت نہیں ہوا جیسے مولوی برکت اللہ مرحوم، اس کے بعد ہمارے اور راجہ صاحب کے اکثر معاملات محبت سے طے ہوتے رہے۔

راجہ صاحب وغیرہ ہندو اکثریت کی بنیاد پر چاہتے تھے کہ معاملات میں جو بھی طے ہو اس میں ہندوؤں کے نقطہ نظر کو ہی ترجیح دیا جائے اور اسی کو سب پر نافذ کیا جائے، جب کہ مولانا سندھی اعداد وشمار کے ساتھ یہ چاہتے تھے کہ جہاں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے، وہاں کوئی فیصلہ مسلمانوں سے پوچھے بغیر نہ کیا جائے اور یہی بات انہوں نے جرمن افسروں کو بھی سمجھائی:

میں نے راجہ صاحب سے ذکر کیا کہ جن صوبوں میں مسلم آبادی زیادہ ہے، وہاں کوئی کارروائی مسلمانوں کے فیصلہ کے بغیر نہ ہونی چاہئے، اس طرح یہ مسئلہ بیرونی لوگوں کے سامنے نہیں آیا تھا، بلکہ سارے براعظم کو اکائی مان کر میجارٹی کے فیصلہ کو ترجیح دی تھی، انہوں نے ہماری بات سنی اور اعداد وشمار میں غور کیا تو ان کی رائے ہمارے موافق ہوگئی، جرمن کمیشن نے کہا کہ ہماری گورنمنٹ نے ایک دفعہ غلطی کی ہے، دوسری دفعہ نہیں کرے گی۔(۲)

حکومت موقتہ ہند کا ایک وفد ماسکو بھیجنے کی بات طے پائی، راجہ مہندر پرتاپ سنگھ کا خیال تھا کہ صرف ڈاکٹر متھرا

---

(۱) ذاتی ڈائری، ص:۶۸ (۲) حوالہ سابق، ص:۷۰

سنگھ کو بھیجا جائے، جب کہ مولانا عبیداللہ سندھی صاحب اس کے خلاف تھے اورانہوں نے اس کے ساتھ ایک مسلم نوجوان کو بھی بھیجنے کی بات رکھی، کافی بحث ومباحثہ کے بعد ان کی رائے مانی گئی اور بعد میں افغان گورنمنٹ نے بھی مولانا کی سیاسی دور بینی کوسراہاجب ماسکو سے وفد واپس آیا تو متھراسنگھ نے صحیح رپورٹ نہیں دی جب کہ اس کے ساتھ گئے مسلم نوجوان جس نے مختصر نوٹس اس سفر کے لے رکھے تھے، اس کی روشنی میں پوری رپورٹ دی اورتب جاکرافغانستانی امراء وحکام کومولانا سندھی کی سیاسی دوراندیشی کاعلم ہوا۔(۱)

مولانا نے افغانستان میں رہ کر حکومت افغانستان کی بھی اہم خدمات انجام دیں، اوران کو ان خدمات کے انجام دینے کا موقع امیر امان اللہ خان کے دورحکومت میں ملا، انہوں نے کچھ مجمل لفظ اس کے بارے میں لکھے ہیں اورکہا کہ آئندہ کا مورخ جب حالات سازگار ہوں گےتو اس راز سے پردہ اٹھائے گا۔

> اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خان کی سلطنت میں چندروز ہم نے اپنی حکومت کی ذرا سے جھلک دیکھ لی، جس قدروہ اپنے وزرا کی پہلی صف پر اعتماد کرتے تھے، ہمارے ساتھ ان کا معاملہ اسی کے قریب قریب تھا، ہم ان کی پرائیوٹ مجلسوں میں شامل ہوتے تو جیسے وہ اپنے خاندان اورقومی بزرگوں کا احترام کرتے تھے، ہم سے ان کا برتاؤ اسی طرح کا ہوتا، ہم نے کوئی مشورہ عرض نہیں کیا جوقبول نہ فرمایا ہو، ہم نے کوئی سفارش نہیں کی جو رد کردی گئی ہو، ایسی حالت میں ہم سے جو کچھ ہوسکتا تھا، ہم نے سلطنت افغانستان کے مستقل ومستحکم بنانے میں کوئی دریغ نہیں کیا، یہ تمام سیاسی معاملات ابھی تک تاریخ کے درجہ تک نہیں پہنچے اس لیے ہم تفصیلات نہیں لکھ سکتے۔

جلاوطن تحریک کا خاتمہ

امیر امان اللہ خان کی حکومت کے خاتمہ اور بچہ سقہ کی حکومت کے قیام کے بعد جلاوطن حکومت اورتحریک کے ذمہ داروں کوگرفتار کرلیا گیااوراس طرح یہ تحریک اورجلاوطن حکومت ملک کے باہر ہی دفن ہوگئی، اس کے ممبران جس کو جہاں سینگ سمایا، کسی نے امریکہ کارخ کیا اورکسی نے جاپان کا، اگرچہ ہرایک نے آزادی کواپنا مشن بنایا، مولانا برکت اللہ بھوپالی تو جاپان جاکر انگریزوں کے خلاف رائے عامہ کو ہموار کرنے کیلئے

(۱)ذاتی ڈائری

اخبار نکالا، جاپانی حکومت نے ملک بدر کیا تو امریکہ چلے گئے اور وہاں غدر پارٹی سے مل کر آزادی کی کوششیں کرتے رہے، یہ انفرادی کاوشیں تھیں، جلاوطن حکومت ختم ہوچکی تھی اور تحریک دفن ہوچکی تھی۔

بچہ سقہ حکومت کے قیام کے بعد جلاوطن حکومت کی جانب سے ایک مشن روس اور دوسرا ترکی بھیجنا طے پایا لیکن دونوں ہی مشن کا عبرت ناک انجام ہوا اور اس مشن کے ممبران کو یا تو پھانسی ہوئی یا پھر انہوں نے انگریزی حکومت سے معافی مانگ کر ساری تفصیلات سے ان کو واقف کرادیا، مولانا سندھی اس بارے میں لکھتے ہیں:

> پہلے مشن کی کامیابی کے بعد یعنی جرمنی کے بعد راجہ صاحب نے دو مشن اور بھیجنے کا فیصلہ کیا، ایک ہمارے منشا کے مطابق استنبول بھیجا گیا، اس میں ہمارے رفیق عبدالباری بی اے اور ڈاکٹر شجاع اللہ مقرر ہوئے، یہ ایران کے راستے استنبول گئے دوسرا مشن مولانا برکت اللہ کی تجویز پر مقرر ہو، اس میں شیخ عبدالقادر بی اے اور ڈاکٹر متھرا سنگھ روس کے راستے جاپان گئے، روش نے دوسرے مشن کو جب روسی سرحد کو عبور کرلیا گیا تھا گرفتار کرلیا اور انگریزوں کے حوالہ کردیا، استنبول مشن کو ایران میں خود انگریزوں نے گرفتار کرلیا، ڈاکٹر متھرا سنگھ ایک بم کیس میں مفرور تھے، اسے پھانسی پر لٹکا دیا گیا، اور باقی تین ممبر نظر بند کردیئے ،عبدالباری جو ہر ایک موقع پر ہمارے ساتھ اور نوجوانوں کی جماعت کا رئیس تھا، سر محمد شفیع کا رشتہ دار نکلا، اسے معافی مانگنے پر راضی کیا گیا، اس نے تمام واقعات حکومت موقتہ ہند اور جنود اللہ اور جماعت مجاہدین کے مفصل لکھ دیے اور باقی دو ممبروں نے اس پر دستخط کردیئے، حکومت ہند روسی مشن کے زمانہ سے واقعات کی تحقیق کیلئے پریشان تھی، اب اسے بااطمینان مفصل حالات کی اطلاع مل گئی۔

انگریزوں کی کوششیں

انگریزوں نے اس جلاوطن حکومت کی تفصیلات معلوم کرنے اور مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے خلاف

وہاں عام ماحول بنانے کیلئے اپنی روایتی شاطرانہ ذہنیت سے کام لیا، پھوٹ ڈالواور حکومت کرو کا جواصول انہوں نے ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے بارے میں اپنایا تھا، وہی یہاں دوسری شکل میں وہابی اور سنی کی آر میں اپنانے کی کوشش کی گئی، اس بارے میں ایک انگریز کا بیان کافی وشافی ہے:

> جس کام کو ہماری فوج سرانجام نہ دے سکی، اسے اندرونی اختلافات اور ڈپلومیسی اور حکمت عملی نے پورا کرنا شروع کر دیا، پشاور کا کمشنر قبائل کے اتحاد کوتوڑنے میں کامیاب ہو گیا، اس نے ایک گروہ کو جس کی تعداد دوسو تھی، اپنے گھروں کو واپس جانے کیلئے بھی آمادہ کیا اور سوات کے پیشوا کو بھی اپنے خاص مریدوں کو منتشر کرنے کیلئے راضی کرلیا تھا، بہت سے چھوٹے چھوٹے سردار اس برگشتگی کو بھانپ کر خود علیحدہ ہو گئے اور باقی ماندہ لوگوں میں بے اعتمادی کا بیج بو گئے۔(۱)

انگریزوں نے مولانا سندھی کے خلاف جو مذہب ومسلک کا جھگڑا کھڑا کرنا چاہا، اس کی وجہ سے مولانا سندھی کے کام میں بھی رکاوٹ پڑی اور خود ان کو سختیوں کا سامنا ہوا، لیکن انہوں نے انگریزوں کے بچھائے جال کو اپنی فراست ودانائی اور سیاسی ہوش مندی کی قینچی سے کاٹ دیا۔

> دیوبندی جماعت فقہ حنفیہ کی پابند ہے لیکن بہت سی غلط رسوم کی تردید میں مولانا اسماعیل شہید کے طریقہ پر ہے، — میں نے بیس سال سندھ میں زندگی بسر کی ہے، میرے بزرگ بس اسی دیوبندی مسلک سے ملے جلتے ہیں، اگرچہ علماء دیوبند سے ان کے افادہ اور استفادہ کا کوئی رابطہ نہیں، ان کے مخالف سندھ میں پیروں اور مولویوں کی تعداد کافی ہے، ہندوستانی حکومت نے ان میں سے ایسے لوگوں کا انتخاب کیا جن کا قندھار کے پیروں سے بہت قوی تعلق تھا، ان کے قندھاری بزرگوں میں سے ایک پیر کابل تشریف لائے اور سردار نائب السلطنت سے ملے اور انہیں یقین دلایا کہ مولانا عبیداللہ حکومت ہند کا فرستادہ ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ افغانستان کے لوگوں کا مذہب خراب کر کے افغانستان حکومت کے اسرار سے انگریزوں کو مطلع کرے، سردار نائب السلطنت کے

(۱) ہمارے ہندوستانی مسلمان، ص ۸۵، ڈبلیوڈبلیوہنٹر

سکریٹری نے ہم سے ذکر کیا، ہم نے اس کو تھوڑا سا سمجھا دیا کہ ہمارے متعلق وہ افغان سی آئی ڈی کے افسروں کو مقرر کر کے حکومت کی رائے معلوم کریں، اس پر جس قدر سزا ہو، اس سے دریغ نہ کریں، اگر ذرا سا شبہ ثابت ہو تو مجھے توپ سے اڑا دیا جائے ،ـــــ ہمیں معلوم ہوا کہ افغان سی آئی ڈی نے کہا کہ مولانا عبیداللہ سندھی انگریزوں کے سخت دشمن ہیں، اور گورنمنٹ ان کو گرفتار کرنا چاہتی تھی، یہ بھاگ نکلے ہیں، اس کے بعد سردار نائب السلطنت نصراللہ خان نے ہمیں خاص طور پر باریاب فرمایا۔

انگریزوں نے صرف اسی پر بس نہیں کیا؛ بلکہ بقول مولانا سندھی صاحب انہوں نے امیر حبیب اللہ خان جو افغانستان کے بادشاہ تھے، ان کو بھی سبز باغ دکھا کر اپنے ساتھ شریک کرلیا، مولانا سندھی لکھتے ہیں:

جو گفتگو اعلیٰ حضرت (امیر حبیب اللہ خان) سے ہوتی، وہ حرف بحرف برٹش قونصل کے ذریعہ وائسرے کو بھیج دی جاتی، اس کے معاوضہ میں کافی روپیہ انگریزوں نے اعلیٰ حضرت کیلئے بھیجا اوران کے سالانہ گرانٹ میں مستقل اضافہ ہوگیا۔(۱)

انگریزوں نے بادشاہ کو اپنی طرف ہموار کر کے ولی عہد سلطنت کے مرشد کو مکہ سے بلا کر اور پتہ نہیں ان سے کیا وعدہ وعید کر کے یہ ذمہ داری دی کہ وہ کسی طرح ولی عہد سلطنت سردار عنایت اللہ خان کو جلاوطن حکومت اور حضرت شیخ الہند کی تحریک سے الگ کریں اور انہیں رسول اللہ ﷺ کے واسطہ سے خواب وغیرہ سنا کر ان کو برگشتہ بھی کردیا:

حضرت صاحب چہار باغ جو کہ معین السلطنت سردار عنایت اللہ خان کے مرشد تھے، ان کو انگریزوں نے مکہ معظّمہ سے اس خدمت کیلئے بلایا تھا اور معین السلطنت کو اپنے قومی ومذہبی فیصلہ سے علیحدہ رکھنے میں کامیاب ہوگئے، انہوں نے یوں خواب سنائے کہ رسول کریم ﷺ نے مجھے مامور کیا ہے کہ میں اس کام کو پورا کروں ۔(۲)

(۱) کابل میں سات سال، ص:۶۱ (۲) حوالہ سابق، ص:۸۱

اس پوری تحریک پر ایک ناقدانہ نظر

جلاوطن حکومت ہو یا پھر حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک، اس میں شک نہیں کہ یہ تحریک ناکامی سے دو چار ہوئی، جیسا کہ اس سے قبل ماضی میں حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک بھی ناکامی کے داغ سے داغدار ہوئی تھی، اس کے اسباب و وجوہات کیا رہے، اس بارے میں مولانا سندھی کے خاص شاگرد پروفیسر سرور صاحب لکھتے ہیں:

> ساری گزشتہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ یاغستان کے آزاد قبائل آپس میں اس طرح بٹے ہوئے ہیں کہ ان کو متفق اور متحد کرنا تقریباً ناممکن ہے، اور جب بھی کبھی مشرق یا مغرب سے کسی منظم حکومت کی طرف سے ان پر حملہ ہوا ہے، تو یہ اس کا مل کر مقابلہ نہیں کر پائے، وہ حملہ خواہ مغلوں نے کیا ہو، یا نادر شاہ ایرانی نے، یہ قبائل ایک مجتمع قوت نہیں اور دوسرے آج توپوں کا توڑے دار بندوقوں سے مقابلہ کرنا کھلی شکست کی دلیل ہے، علاوہ ازیں ان قبائل پر روپے کا جادو جتنا کارگر ہوتا ہے، اس کا تو ذکر ہی رہنے دیجئے، نیز ان کی آپس کی رقابتوں کو جتنی آسانی سے ابھارا جا سکتا ہے، اس کا علم کس کو نہیں، ایسی بٹی ہوئی بنیادی طور پر کمزور اور ہوا کے ہر جھونکے ساتھ منتشر ہو جانے والی طاقت پر اتنی امید رکھنا یہ سادہ لوحی گزشتہ سوڈیڑھ و سال سے ہندوستانی مسلمانوں کی خصوصیت رہی ہے، بزرگوں کے اس سہو کو بدقسمتی سے بعد والوں نے مشعل راہ بنا لیا، اور حضرت سید احمد شہید کی شہادت کے بعد ان کے نام لیوا اسی یاغستان میں مجاہدین کا ایک مرکز بنا کر بیٹھ گئے —— حضرت شیخ الہند بھی اسی سہو میں مبتلا تھے، اور اسی بناء پر انہوں نے اپنی تمام توجہ بھی یاغستان کے مرکزی طرف مبذول رکھی، اور اس سے اس قدر امیدیں وابستہ کیں۔(۱)

یہ تنقید آسان ہے لیکن دیکھا جائے تو حضرت شیخ الہند نے ایسا نہیں کہ اندرون ہند کوئی کام نہیں کیا؛

---

(۱) کابل میں سات سال، ص: ۱۴

بلکہ ان کی تحریک دو محاذ پر چل رہی تھی، اندرون اور بیرون، حضرت شیخ الہند نے اپنے آدمیوں کو ہندوستانی پولیس فورس اور فوج میں بھرتی کرایا، پورے ملک میں اپنے شاگردوں کے ذریعہ بغاوت اور انقلاب کی ذہن سازی کرائی گئی، اور یہ طے پایا کہ جب بیرونی طاقتیں ملک پر حملہ کریں گی تو اندر سے بھی اسی وقت بغاوت ہوگی اور انگریزی حکومت کیلئے دو محاذوں پر لڑنا ناممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور ہو جائے گا، لیکن افسوس کہ تحریک کا راز قبل از وقت آشکار ہو گیا، وکان امر اللہ قدرا مقدورا۔

○○○

مہاتما گاندھی اور نمک ستیہ گرہ

مولانا محمد اسعد ندوی ❖

ہندوستان جیسا ملک جہاں روز اول سے تحریکوں کا سلسلہ جاری ہے، اس میں انگریزوں کے ظالمانہ اقتدار سے نجات حاصل کرنے کی خاطر جو جدوجہد کی گئی اور وقت وحالات کے پس منظر میں جو تحریکیں اٹھتی رہیں، اگر ان کا سال بہ سال جائزہ نہ لیا اور نئی نسل کو اُن کی افادیت اور قوت تنفیذ سے واقف نہ کرایا جائے تو دھیرے دھیرے نئی نسل ملک کی تعمیر وترقی اور اس کی آزادی کی خاطر جان توڑ کوشش کرنے والے اسلاف کے کارناموں سے نہ صرف ناواقف ہوگی بلکہ اپنے ماضی کی روشن تاریخ سے ٹوٹ جائے گی، اور بھگوا سیاست کے زمانہ میں جہاں حکومت کی سرپرستی میں تاریخ کو مسخ کرنے بالخصوص مسلمانوں کی تاریخ کو حرف غلط کی طرح ہندوستان کے نقشہ سے مٹانے کی جو مذموم کوششیں ہوہی ہیں، اس کے اثرات کا سادہ لوح ذہن ودماغ پر مرتب ہونا لازمی ہے، جس کے نتیجہ میں مسلمان بچے خود بخود اپنے اسلاف سے نہ صرف یہ کہ بددل ہوں گے بلکہ انھیں برا بھلا کہنا شروع کردیں گے، اور بہت ممکن ہے وہ ایک مرحلہ میں اپنے مذہب سے بھی بیزار ہوکر الحاد کے راستہ پر گامزن ہوجائے۔

اس لئے ہمیں اپنی آزادی کی تاریخ اور اس میں مسلمانوں کی حصہ داری پر کھل کر بولنے اور لکھنے کی ضرورت ہے، تاکہ تاریخ کے توسط سے ماضی سے ہمارا رشتہ قائم رہے اور کڑی سے کڑی جڑتی رہے اور علامہ شبلیؒ کی زبان میں:

''مسلمانوں کی ترقی آگے بڑھنے میں نہیں بلکہ ماضی کی طرف لوٹنے میں ہے۔''

ماضی کے تعلیمی وتحریکی نظریات سے جب تک استفادہ نہیں کیا جائے گا، اس وقت تک ترقی کی راہیں مسدود رہیں گی، اور جب تک ہماری نئی نسل کو اپنے اسلاف کے روشن کارناموں پر اطمینان نہ ہوگا اس وقت تک

❖ آرگنائزر تفہیم شریعت کمیٹی، آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ

اپنی جماعت اور اپنے افرادکار پر اعتماد نہ ہوگا، اور جب اپنی تاریخ پر اعتماد ہوگا تب اولوالعزمی اور ہمت وحوصلہ کے ساتھ ترقی کا زینہ چڑھنا ممکن ہو سکے گا۔

اولوالعزمانِ دانشمند جب کرنے پہ آتے ہیں
سمندر پاٹتے ہیں، کوہ سے دریا بہاتے ہیں

ایک طرف ماضی کی روشن تاریخ کی نہ صرف بقا بلکہ نئی نسل کا اس پر اعتماد قائم رہے یہ مسئلہ دامن گیر ہےتو دوسری طرف آزادی کیا ہے؟ اور اس کی حقیقت کیا ہے؟ اور مسلمانوں نے غیر مسلموں کے ساتھ کس حد تک اتحاد ویکجہتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس معرکہ کو سر کرنے کی کوشش کی ہے؟ اسے بھی جاننا ہر حال میں ضروری ہے، کیونکہ آزادی نام ہے عزت وناموس کی حفاظت کا، اخلاق وکردار کو آزادی سے اپنانے کا، تجارت ومعیشت کے تحفظ کا، فکر وخیال کی آزادی کا اور باہمی ہمدردی سے زندگی بسر کرنے کا، جسے مولانا ابوالکلام آزادؒ نے کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

''اسلام ایک طرف مسلمانوں کی تعریف یہ بتاتا ہے کہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمانوں کو تکلیف نہ پہنچے، دوسرے طرف مسلمانوں کی حقیقت یہ ظاہر کرتی ہے کہ اگر خدا وشیطان، حق وباطل، معروف ومنکر اور خیر وشر کا مقابلہ ہوتو وہ رضائے خدا، نصرت حق، امر بالمعروف ونہی منکر اور دعوتِ خیر کے لئے آسمانوں کے نیچے کسی ہستی کی پروانہیں کرتے۔''(۱)

مولانا مرحوم کے نزدیک اخلاق کی جان حریت رائے، استقلالِ فکر اور آزادیٔ قوم ہے، آپ کے خیال میں:

''قوم کے نظام اخلاق ونظام عمل کے لئے اس سے زیادہ کوئی خطرناک امر نہیں کہ موت کا خوف، شدائد کا ڈر، عزت کا پاس، تعلقات کے قیود اور سب سے آخر قوت کا جلال وجبروت افراد کے افکار وآراء کو مقید کردے، ان کا آئینہ ظاہر باطن کا عکس نہ ہو۔''(۲)

آپ کے نزدیک اس سے زیادہ مکروہ ومبغوض شے اللہ کی نظر میں کوئی نہیں۔

---

(۱) اسلام اور آزادی، ص:٦ (۲) حوالہ سابق، ص:٦٠

آپ کے نزدیک غلامی خدا کی مرضی اور اس کے قانون کے خلاف ہے، چنانچہ آپ اپنے اس اعتقاد کا یوں اعلان کرتے ہیں:

''آزاد رہنا ہر فرد اور قوم کا پیدائشی حق ہے، محکومی اور غلامی کے لئے کیسے ہی خوش نما نام کیوں نہ رکھ لئے جائیں، لیکن وہ غلامی ہی ہے اور خدا کی مرضی اور اس کے قانون کے خلاف ہے۔''(۱)

ہمارے ملک کی بدقسمتی رہی ہے کہ ایک دور ایسا بھی آیا جس میں غیر ملکی طاقتوں کا تسلط قائم ہوا، جس نے ہماری تمام تر ذہنی، عقلی اور فکری آزادی پر قدغن کھڑی کر دی ہے، ملک ہمارا ہے، ہم اس مٹی سے پیدا ہوئے، ہمارا خمیر مادر وطن سے تیار ہوا، مگر ہمیں حکومت کرنے کا اختیار نہ تھا، اقتدار سے محرومی ہمارا مقدر بن چکی تھی، حق بولنا، حق لکھنا اور حکومت کی پالیسی کے خلاف آواز بلند کرنے کا حق ہم سے سلب کر لیا گیا تھا، آزاد فضا میں آزادی سے غور وفکر کرنا گویا جرم تھا، حقیقت پسندی کا اظہار بھی نہ صرف قابل ملامت تھا بلکہ گردن زدنی کا سبب تھا، اعضاء وجوارح بظاہر ہمارے تھے، مگر ان کے استعمال کے ہم مکلف نہ تھے، خلاصہ یہ کہ ہر طرف ظلم کا دور دورہ تھا، جبر واستبداد نے ہماری صلاحیتوں کو اپنے جبڑے میں دبا رکھا تھا، جس سے نکلنا ہمارے لئے ممکن نہ تھا۔

ایسے ظالم اور ڈکٹیٹر نظام کے خلاف ہمارے بزرگوں نے تحریک چلائی اور ایک طویل جدوجہد کے بعد ہمارا ملک آزاد ہوا، مگر آزادی حاصل کرنے میں جن تحریکوں نے اپنا اپنا رول اور کردار ادا کیا اُن میں ایک اہم تحریک ''نمک ستیہ گرہ'' بھی تھی، جس کی قیادت گاندھی جی نے کی تھی، گاندھی جی ایک صاف ستھرے انسان تھے، اُن کی حق گوئی اور صاف گوئی ضرب المثل تھی، واقعہ چاہے معمولی ہوتا یا غیر معمولی دونوں صورتوں میں صاف گوئی سے کام لیتے اور یہ عادت بچپن ہی سے گویا ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی، حق گوئی اور راست بازی ایک ایسی خصلت ہے جو انسان کی زندگی کی تمام تر خوبصورتی کی جڑ ہے، جب تک زندگی کی یہ جڑ سیراب ہوتی رہے گی اس وقت تک زندگی کی خوبصورتی میں نکھار آتا رہے گا، چنانچہ اسرار احمد صاحب گاندھی جی کے حالات مرتب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''گاندھی جی بچپن ہی میں بہت زیادہ شرمیلے واقع ہوئے تھے، انہوں نے

(۱) اسلام اور آزادی، ص: ۷۰

اپنے استادوں اور ہم مکتب لڑکوں سے کبھی جھوٹ نہ بولا تھا، چنانچہ اس سلسلہ میں ایک واقعہ خود انہوں نے بیان کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہائی اسکول میں داخل ہونے کے بعد ایک مرتبہ مدارس کے انسپکٹر مسٹر جائیس ان کے مدرسہ کے معاینہ کے لئے آئے، اور انہوں نے گاندھی جی کے ہم جماعت لڑکوں سے انگریزی کے پانچ الفاظ لکھوائے، گاندھی جی نے ایک لفظ کا ہجے غلط لکھا، تو استاد نے اپنی بوٹ کی نوک سے انہیں ٹھوکر مار کر اس غلطی سے آگاہ کرنے کی کوشش کی، گاندھی جی اس واقعہ کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''یہ بات کسی طرح بھی میری سمجھ میں نہیں آسکتی تھی کہ وہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے ساتھی کی سلیٹ سے ہجے نقل کروں، یہ میرے خیال میں استاد وہاں تھے ہی اس لئے کہ ہمیں نقل نہ کرنے دیں۔''

غرض یہ کہ گاندھی کی اپنے خاندانی اثر اور ذاتی رجحان کے ماتحت بے حد نیک اور سچے واقع ہوئے تھے، اُن کی انہی خوبیوں کی وجہ سے اُن کے استاد اُن سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے، انہی چال چلن کے سلسلہ میں اچھی اچھی سندیں دی جاتی تھیں اور اس زمانہ میں انہیں کئی وظیفے بھی ملتے رہے۔

دنیا کے بڑے اور لائق ترین لوگوں کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ ابتدا ہی سے اپنی کمزوریوں اور لغزشوں کے بارے میں حساس واقع ہوتے ہیں، معمولی سی کمی کوتاہی جو ان سے سرزد ہو جاتی ہے وہ ان کے دل میں کھٹکنے لگتی ہے، اور وہ اپنی اس کمزوری کا اعتراف بھی کرتے ہیں اور اسے دور کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں، گاندھی جی میں یہ خوبی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، یعنی ایک بلند ترین عالی ظرف انسان ہونے کے ناطے جب بھی ان سے معمولی سے معمولی چوک ہوتی وہ فوراً اس پر متنبہ ہوتے اور اس کی اصلاح کی کوشش کرتے، چنانچہ ان کے بارے میں لکھنے والے نے کیا خوب لکھا ہے:

''گاندھی جی اس عہد کے بلند ترین انسان تھے، یا یہ کہنا چاہئے کہ وہ انسان تھے کیونکہ انسانیت کے درجات قائم کرنا خود انسانیت کی توہین ہے، اس لئے انہیں اپنی کمزوریوں، کوتاہیوں اور غلطیوں کے اعتراف میں کبھی جھجک محسوس نہیں ہوئی، حتیٰ کہ انہوں نے اپنی غلطیوں کا بھی بے تکلفی کے ساتھ اعتراف کر لیا

جو اس زمانہ میں سرزد ہوئی تھیں جسے جوانی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور
جنہیں عموماً نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔''

اتنے بلند کردار انسان کا آزادی کی تحریک میں اہم رول ادا کرنا، اور آزادی کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنا ہر اعتبار سے قرین قیاس نظر آتا ہے، کیونکہ بلند کردار کا حامل انسان ہی کوئی بڑا کام کر سکتا ہے، ورنہ اخلاقی پستی کا شکار انسان کبھی بھی بلندی سے ہمکنار نہیں ہوسکتا۔

موہن داس کرم چند گاندھی، جو مہا تما گاندھی کے نام سے مشہور ہیں، ستیہ گرہ اور عدم تشدد کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے انہوں نے ہندوستان کو آزادی دلانے میں اہم کردار ادا کیا، ان کے اصولوں نے پوری دنیا کے لوگوں کو شہری حقوق اور آزادی کی تحریک کے لئے لڑنے کا ہنر سکھایا، انہیں بابائے قوم بھی کہا جاتا ہے، سبھاش چندر بوش نے سنہ ۱۹۴۴ء میں رنگون ریڈیو سے گاندھی جی کے نام جاری کی جانے والی نشریات میں انہیں ''بابائے قوم'' کے نام سے خطاب کیا۔

سوراج اور نمک ستیہ گرہ

عدم تعاون موومنٹ کے دوران گرفتاری کے بعد گاندھی کو فروری ۱۹۲۴ء میں رہا کیا گیا تھا، اور وہ ۱۹۲۸ء تک سرگرم سیاست سے دور رہے، اس دوران انہوں نے سوراج پارٹی اور کانگریس کے مابین اختلافات کو کم کرنے کی کوشش جاری رکھی، اور اس کے علاوہ چھوا چھوت، شراب نوشی، جہالت اور غربت کے خلاف بھی لڑتے رہے۔

اسی دوران برطانوی حکومت نے سرجان سائمن کی سربراہی میں ہندوستان کے لئے ایک نیا اسٹیٹو ریفارم کمیشن تشکیل دیا، لیکن اس کے ممبروں میں سے کوئی بھی ہندوستانی نہیں تھا، جس کی وجہ سے ہندوستانی سیاسی جماعتوں نے اس کا بائیکاٹ کیا، اس کے بعد دسمبر ۱۹۲۸ء کے کلکتہ اجلاس میں گاندھی جی نے برطانوی حکمرانوں سے کہا کہ وہ ہندوستانی سلطنت کو اقتدار دیں، اور ملک کی آزادی کے لئے عدم تعاون کی تحریک کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہیں، بھارتی پرچم ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء کو لاہور میں لہرایا گیا تھا، جب انگریزوں کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا اور کانگریس نے ۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء کو یوم آزادی کے طور پر منایا، اس کے بعد گاندھی جی نے حکومت کی طرف سے نمک پر ٹیکس لگانے کے خلاف احتجاج میں نمک ستیہ گرہ شروع کیا، جس کے تحت انہوں نے ۱۲ مارچ سے ۱۶ اپریل تک گجرات کے احمد آباد سے ڈانڈی تک تقریباً ۳۸۸ کلومیٹر کا سفر

کیا، اس سفر کا مقصد خود نمک پیدا کرنا تھا، اس سفر میں ہزاروں ہندوستانیوں نے حصہ لیا، اور انگریز حکومت کا رخ موڑنے میں کامیاب ہوگئے، اس دوران حکومت نے ۶۰ ہزار سے زائد افراد کو گرفتار کرلیا اور انہیں جیل بھی دیا۔

اس کے بعد لارڈ ارون کی نمائندگی کرنے والی حکومت نے گاندھی جی کے ساتھ بات چیت کرنے کا فیصلہ کیا، جس کے نتیجہ میں گاندھی-ارون معاہدہ پر مارچ ۱۹۳۱ء میں دستخط ہوئے، گاندھی ارون معاہدہ کے تحت برطانوی حکومت نے تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کرنے پر اتفاق کیا، اس معاہدہ کے نتیجے میں گاندھی نے لندن میں منعقدہ گول میز کانفرنس میں کانگریس کے واحد نمائندہ کی حیثیت سے شرکت کی، لیکن یہ کانفرنس کانگریس اور دیگر قوم پرستوں کے لئے انتہائی مایوس کن تھی، اس کے بعد گاندھی کو دوبارہ گرفتار کرلیا گیا اور حکومت نے قوم پرست تحریک کو کچلنے کی کوشش کی۔

○○○

ہندوستان کی تقسیم-اسباب ومحرکات

مولانا محمد ارشد قاسمی ❖

یہ سچ ہے کہ سنہ ۱۹۴۷ء میں بھارت کی تقسیم مسلم لیگ کے ذریعے مسلمانوں کے لئے ایک الگ ملک کا مطالبہ کئے جانے کی وجہ سے ہوئی اوراس سچ کو بھی جھٹلایا نہیں جاسکتا کہ مسلم لیگ میں اس مطالبے کے ذریعہ اوراس کی حمایت میں مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی کو متاثر ومتحرک کرنے کی اہلیت تھی؛لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اس وقت مسلم آبادی کا ایک بڑا حصہ اور کئی مسلم تنظیمیں پاکستان کے اس مطالبے کی مخالفت کر رہی تھیں۔ان لوگوں نے نظریاتی طور پر مسلم لیگ کو چیلنج کیا اور بعد میں پاکستان کی مانگ کرنے والوں سے دوسرے مسلمانوں نے سڑکوں پر مقابلہ کیا، انہوں نے جرأت وحوصلہ کے ساتھ لیگ کا مقابلہ کیا اوراس عظیم کام میں اپنی جانوں کی قربانیاں بھی دیں۔

اسباب تقسیم کے ذکر سے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان وہ کون کون سے تمدنی،نفسیاتی،معاشرتی یا مذہبی اختلافات تھے جن کی وقت پر نوٹس نہ لینے کی وجہ سے ایسے حالات پیدا کردیئے گئے تھے کہ ملک بھارت کو دوحصوں میں تقسیم ہونا پڑا۔

برصغیر ہندو پاک میں مسلمان اور مذہب اسلام کی ابتدا بھارت کے مغربی ساحل سے ہوئی،مسلمان تاجر عرب اور بھارت کے مغربی ساحل پر آتے جاتے تھے گویا مسلمانوں کا مذہب اور کلچر مسلم فاتحین کی آمد سے قبل برصغیر میں پہنچ چکا تھااوراپنی جڑیں جمارہا تھا۔فطری طور پر مسلم فاتحین کے ساتھ ان کا دین،فلسفۂ حیات، کلچر،طرز معاشرت،اورنظریات بھی آئے،اورآہستہ آہستہ اس نے اپنی علاقائی حیثیت مستحکم کرلی،مسلمان تاجر اور مسلم فاتحین کے سنگم سے مذہب اسلام کا فروغ پورے ملک میں ہوا؛لیکن تاریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ مسلم سلاطین کا مقصد مذہب اسلام کا فروغ بالکل نہیں تھا۔

❖ استاذ شعبۂ انگریزی:المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

رفیق زکریا جو ایک پکے کانگریسی ہیں اپنی مشہور کتاب The struggle within Islam صفحہ ۱۳۰ پر لکھتے ہیں:

> Whatever might have been the initial urge and intent of the Muslim Conquerors, each of them- the Ghoris, the Khiljs, the Tughlaks, the Lodis and the Mughals- established a pattern of administration which was different from what existed in other parts of the Muslim world. The invaders, no doubt, confirmed to the rules of the shari'ah in the beginning, including the imposition of the jaziya on their non-Muslim subjects. But this was prompted more from a desire to enhance their revenue than from a sense of religious duty. Almost all the rulers who founded kingdoms in India gave little or no importance to proselytizing or conversion of their subjects to Islam. Also they did not attempt to turn their empires into theocracies, for they were essentially soldiers eager to annex more and more territories and consolidate what they had conquered.(۱)

پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے اپنی کتاب The Preaching of Islam کے صفحہ ۵ پر لکھا ہے کہ مذہب اسلام کے طویل وعریض خطوں میں اشاعت کی وجہ مسلم مبلغوں داعیوں کی کاوش اور محنت ہے نا کہ مسلم فاتحین اور سلاطین کی فتح وکامرانی۔

> Thus from its very inception Islam has been a missionary religion, both in theory and in practice, for the life of Muhammad exemplifies the same teaching, and the Prophet himself stands at the head of a long series of Muslim missionaries who have won an entrance for their faith into the hearts of unbelievers.

---

(۱) The struggle within Islam. pp: 130, By Rafeeque Zakariya

> Moreover it is not in the cruelties of the persecutor or the fury of the fanatic that we should look for the evidences of the missionary spirit of Islam, any more than in the exploits of that mythical personage, the Muslim warrior with sword in one hand and Qur'an in the other, but in the quiet, unobtrusive labours of the preacher and the trader who have carried their faith into every quarter of the globe.(۱)

اشاعت اسلام کی تحریک کا نشان دعاۃ اسلام اور تجار کی خاموش کوششوں میں ملتا ہے جنہوں نے اسلام کو دنیا کے ہر گوشہ میں شائع کیا، یہ اشاعت پر امن طریقہ سے ہوئی، پوری تاریخ اس سلسلہ میں خاموش ہے کہ اسلام کی اشاعت کے نتیجہ میں کہیں کوئی نزاع پیدا ہوا ہو، ملک بھارت میں بھی اسلام داعیوں اور مبلغوں کی محنت کا نتیجہ ہے، مسلمانوں نے یہاں کچھ ایسا نہیں کیا کہ جس کا کوئی اہم رول ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ نزاع پیدا کرنا ہو۔ تاہم ایسا سمجھنا کہ بھارت میں دوران حکومتِ مسلم ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان سماجی، معاشرتی یا مذہبی میدان میں کوئی تناؤ پیدا نہیں ہوا، بہت سطحی طور پر مسترد کر دینے کے مترادف ہوگا، ہندو مسلم دو معاشرتوں کے ارتباط سے ایک کمپوزٹ کلچر کی داغ بیل تو پڑی اور اس کی نشونما بھی ہوئی تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دونوں کے درمیان مادی اور اساسی طور پر کم از کم تفاوت تو موجود تھا، مسلمان ایک خدائے واحد پر ایمان کے ساتھ ذات پات سے مبرا معاشرت پر یقین رکھتے تھے جبکہ ہندو متعدد خداؤں پر ایمان کے ساتھ ورن آشرم کے قائل تھے، مورتی پوجا اس کا ایک لازمی جزو تھا جبکہ اسلام حتمی طور پر اس کا مخالف، اس کے علاوہ دونوں کے عادات، معاشرت، تہذیب وتمدن میں بھی بنیادی فرق تھا، مسلمانوں میں کھلا پن تھا تو ہندوؤں میں اپنی ذات اور اپنے سماج کے اندر جینے کی تنگی، مسلمان غیروں کو بھی اپنے مذہب مین خوش آمدید کہتے تھے تو ہندو ایک بڑے طبقہ کو جوان کا ہم مذہب تھا، ان کو بھی برابری کی سطح دینے سے انکاری تھے۔

اس طرح ہم دیکھ سکتے ہیں کہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں اختلاف اور نزاع کے اسباب موجود تھے لیکن دونوں چھوٹے موٹے اختلافات کے ساتھ بقائے باہم کا دم بھرتے رہے؛ لیکن یہ نزاع کی چنگاری کبھی شعلہ اس لیے نہیں بنی کہ مسلمان اقلیت میں ہونے کے باوجود صاحب حکومت تھے یا پھر ہندو اور مسلمان دونوں

The Preaching of Islam, pp: 5, by T.W. Arnold (۱)

ایک تیسری حکومت برطانیہ کے زیرنگیں تھے،اس ملک میں ہندومسلم اتحاد کی تاریخ میں کئی مثالیں ملتی ہیں ، انگریزوں کے خلاف ۱۸۵۷ء کی بغاوت ان میں سے ایک ہے۔

ریولٹ آف ۱۸۵۷ء

۱۸۵۷ء میں غیرملکی حکومت سے چھٹکارہ حاصل کرنے کی غرض سے پہلی جنگ آزادی لڑی گئی، اس میں ہندومسلم شانہ بہ شانہ لڑے؛ بلکہ مسلمانوں نے کچھ زیادہ ہی شدت سے انگریزوں کی مخالفت کی؛ کیونکہ مسلمانوں سے ہی تو انگریزوں نے حکومت ہتھیائی تھی، اسی لئے جب غدر کی کوششیں ناکام رہیں تو بدلے کی کاروائی میں انگریزوں نے ان ہی کو زیادہ ہدف ستم بنایا، وہ یہ سمجھ گئے تھے کہ اگر ہندومسلم متحد رہے تو یہ ان کے لئے بڑے مصائب اور مسائل پیدکر سکتے ہیں۔

ریولٹ آف ۱۸۵۷ء بھی ہندومسلم اتحاد کی بہترین مثال ہے، اس میں ہندواور مسلم تمام راجاؤں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف جنگ کی، اورسب نے بہادر شاظفر کو اپنا کمانڈر منتخب کیا تھا، اس بغاوت کے بعد کمپنی کی حکومت ختم ہوئی اور برٹش حکومت کا آغاز ہوا،لیکن اس بغاوت کے بعد برٹش حکومت کو خوف تھا کہ اگر ایسے انقلاب آئے تو ان کی حکومت بھی خطرے میں ہے؛ اس لئے برٹش راج نے اپنی مشہور زمانہ 'ڈیوائڈ اینڈ رول' کی پالیسی اپنائی، انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کے پس منظر پر اگرنظر ڈالیں تو یہ پالیسی مزید سمجھ میں آئے گی، برطانوی استعمار نے اپنی حکومت کے استحکام اور بقا کے لئے ہندوستانیوں کی ایک جماعت کے ساتھ اتحاد کی کوشش کی، اس مقصد کے پیش نظر اس نے ہندو، عیسائی اور پارسیوں کو تلاش کیا اور ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد ڈالی، ۲۸؍دسمبر کو بمبئی میں اس کا پہلا اجلاس ہوا جس کی سرپرستی اور صدارت مسٹر اے-او- ہیوم نے کی، اس پارٹی کے قیام کا مقصد کیا تھا؟ اس کو مسٹر ستیہ پال (کانگریس کے ساٹھ سال) کے مؤلف کے الفاظ میں سنیے:

> ''اس کا قیام ہندوستان کی بہتری کے لئے نہیں بلکہ؛ برٹش حکومت کی جڑوں کو مضبوط و مستحکم کرنا تھا،تعلیم یافتہ طبقہ برٹش طرز حکومت کا دلدادہ تھا۔''(۱)

برٹش آفیسر اے-او- ہیوم نے ہی رپورٹ آف ریولٹ ۱۸۵۷ء لکھی، اس میں انہوں نے لکھا تھا کہ یہ بغاوت برٹش حکومت کی ظلم وزیادتی کی وجہ سے ہوئی تھی، اس میں انہوں وائسرائے ڈفرین پر بھی تنقید بھی

---

(۱) ص: ۱۱۰

کی جس کے نتیجہ میں ان کو ان کی رینک سے ہٹا دیا گیا، بالآخر انہوں نے خود ہی اپنی نوکری سے استعفٰی دے دیا، ان کی مشہور نظم 'Old Man's Hope' کے عنوان سے ہے، اس نظم سے بھارتیوں کے اندر ایک الگ اور آزاد ملک کے مطالبہ کا حوصلہ پیدا ہوا، وہ نظم مندرجہ ذیل ہے:

Sons of Ind, why sit ye idle,
Wait ye for some Deva's aid?
Buckle to, be up and doing!
Nations by themselves are made!

Yours the land, lives, all, at stake, tho'
Not by you the cards are played;
Are ye dumb? Speak up and claim them!
By themselves are nations made!

What avail your wealth, your learning,
Empty titles, sordid trade?
True self-rule were worth them all!
Nations by themselves are made!

Whispered murmurs darkly creeping,
Hidden worms beneath the glade,
Not by such shall wrong be righted!
Nations by themselves are made!

Are ye Serfs or are ye Freemen,
Ye that grovel in the shade?
In your own hands rest the issues!
By themselves are nations made!

Sons of Ind, be up and doing,
Let your course by none be stayed;
Lo! the Dawn is in the East;
By themselves are nations made!

دوقومی نظـریہ کا آغـاز

انڈین نیشنل کانگریس انڈین نیشنل ازم کے لئے ایک مرکزی تنظیم قرار پائی، کانگریس نے مطالبہ کیا کہ تعلیم یافتہ بھارتیوں کوحکومت میں زیادہ حصہ داری دی جائے، اس مطالبہ سے اُس وقت کے وائسرائے ڈفرین کو اس سے خطرہ محسوس ہوا، چنانچہ برطانوی حکومت نے کانگریس کی سرگرمیوں کو (نان پولیٹکل شوشل ریفارمس) تک محدود کردیا اور سرکاری ملازموں کے لئے اس میں شرکت کوممنوع قرار دے دیا۔

کانگریس اپنی سرگرمیوں میں مصروف عمل رہی اور اس نے ۱۸۸۷ء میں حکومت سے مطالبہ کیا کہ آئی سی ایس امتحان بھارت میں ہوں، برطانوی سرکار کے حامیوں نے کانگریس کے اس مطالبہ کی مخالفت کی اور لوگوں سے کہا کہ وہ کانگریس سے دور رہیں، یہیں سے دوقومی نظریہ کا آغاز ہوتا ہے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تناؤ اور دوریاں

ہندوؤں میں خودشناسی، بیداری اور خوداعتمادی کا عمل برطانوی اقتدار کے استحکام کے ساتھ ساتھ شروع ہوگیا تھا، سراج الدولہ اور ٹیپو کی شکستوں کے بعد برٹش حکومت کی ہندوستان میں مستقل پالیسی ہوگئی تھی کہ مسلمانوں کے دلوں سے بادشاہت کے تصورات ختم کئے جائیں اور ہندوؤں کو ملک کی زندگی کے ہر پہلو میں آگے لایا جائے، ہندوستان کی تجارت، صنعت، زمینداریوں اور سرکاری ملازمتوں سے مسلمانوں کو محروم کرنے کے باقاعدہ منصوبے بنائے گئے اور ان کی جگہ ہندوؤں کی ہمت افزائی گورنمنٹ کی پالیسی کا اہم جزو قرار پایا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنگال میں کاشتکار اور محصل زمیندار ہوگئے اور مسلمانوں کی زمینداریاں ختم ہوگئیں، تجارت اور صنعت میں مسلمانوں کی پوزیشن مزدوروں اور کاریگروں کی رہ گئی، منڈیوں اور کارخانوں پر ہندوؤں کا قبضہ ہوگیا، سرکاری ملازمتوں میں ہندوؤں کو اجارہ داری حاصل ہوگئی، حتی کی ان کی اکثریت کے علاقوں میں بھی ان کا تناسب صفر کے برابر ہوگیا، ۱۸۵۷ء کی جنگ کے بعد مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان خلیج ناقابل عبور حد تک وسیع ہوگئی، انگریزوں کے خلاف نفرت کا یہ عالم تھا کہ ان کا تمدن، انگریزی تعلیم اور ملازمت حرام ہوگئے، اب ہندوؤں میں مختلف رجحانات ہونا یقینی تھا؛ چنانچہ اس قوم میں مسلمانوں کے تئیں دوطرح کے رجحانات پائے جانے لگے، پہلا: اسلام اور مسلمانوں سے مفاہمت، تعلقات کی استواری اور ساتھ لے کر چلنے کی کوشش اور دوسرا: اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت اور تنقید، ان سے بے تعلقی یا انہیں نظرانداز کرنا، راجہ موہن رائے، اور

موہن داس کرم چند گاندھی پہلے رجحان کے علم بردار تھے تو بنکم چندر چٹرجی ، بال گنگا تلک اور ونئے دامودر ساورکر دوسرے رجحان کے حامل افراد تھے۔

۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن نے بنگال جیسے بڑے صوبے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا، جس میں چاٹگام، ڈھاکہ اور راج شاہی کمشنریوں اور آسام کو ملا کر ایک الگ صوبہ بنا دیا ، اتفاق سے اس نئے صوبے میں مسلمانوں کی اکثریت تھی ، اس پر زبردست واویلا ہوا، کانگریس نے پورے ملک میں اس کے خلاف تحریک چلائی، ہندو احیائی تحریکیں بھی ساتھ ساتھ رہیں، مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی مشہور کتاب 'انڈیا ونس فریڈم' میں لکھا: ''کانگریس نے محسوس کیا کہ صوبہ بنگال کی تقسیم کا مقصد ہندوؤں کو کمزور کرنا تھا۔'' بہرحال ایسی سورش بپا ہوئی کہ سرکار کو بالآخر ۱۹۱۱ء کو تقسیم بنگال کو واپس کرنا پڑا۔ یہ تقسیم ہند کا پہلا بیج تھا جو لارڈ کرزن نے بنگال کی تقسیم کر کے بویا تھا۔

بنکم چندر چٹرجی نے ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف ابھارا، ان کا ناول 'آنند مٹھ' کا پانچواں ایڈیشن مسلمانوں کے خلاف جذبات اور واقعات سے پُر ہے، بنکم ایک ہندو احیاء پرست ناول نگار تھے، وندے ماترم انہیں کی تخلیق ہے، اس کو انہوں نے اپنی کتاب 'آنند مٹھ ۱۸۸۸ء' میں شامل کیا، اور اس کا مرکزی تصور یہ ہے کہ ہندو سادھوؤں کا ایک گروہ ہے جو مسلمانوں اور عیسائیوں کو ملک سے کھدیڑنے کی بات کرتا ہے، کتاب میں مسلمانوں کے لئے بدترین مغلظاتی الفاظ استعمال کئے، اس کتاب نے مسلمانوں کے خلاف زہر افشانی کا کام کیا، وندے ماترم کو وطن کے دیوی کالی کا پرتیک بتایا گیا، تقسیم بنگال کے خلاف چلائی گئی تحریک میں یہ بکثرت استعمال ہوتا تھا اور نعرہ کا بھی کام دیتا تھا، ظاہر ہے یہ مسلمانوں کے لئے صرف کراہیت انگیز ہی نہیں بلکہ اس کے پس منظر پر نظر رکھی جائے تو دل آزار بھی تھا۔

تقسیم ہند کے اسباب

۱۔مسلم لیگ کا قیام

ان حالات میں مسلمانوں کے ایک دانشور سر آغا خان نے محسوس کیا کہ سماجی اور تعلیمی ترقی کے ساتھ ساتھ سیاسی دائرہ اثر کو بڑھانا ضروری ہے، اس کے لئے انہوں نے اپنے کانگریسی دوستوں سے بھی کہا کہ وہ اپنے اثر ورسوخ کا استعمال کریں اور کانگریس کو یہ باور کرائیں کہ مسلمانوں کو اعتماد میں لینا کتنا اہم ہے، اپنے ان

محرکات کا ذکر کرتے ہوئے آگے لکھتے ہیں کہ جب ہماری تمام امیدوں کو محرومی کا سامنا ہوا تو سید امیر علی نے مجھے تقویت دی اور کہا کہ برطانوی سرکار سے انصاف پسندانہ سلوک حاصل کرنے کے لئے اس کو یہ باور کرانا ضروری ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو تمدنی، مذہبی اور تاریخی خلا ہے وہ کتنا گہرا ہے، اسی لئے ہمیں ایک فورم اور پلیٹ فارم چاہیے، بالآخر وہ فورم اور پلیٹ فارم آل انڈیا مسلم لیگ کی شکل میں تشکیل ہوا۔

۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام ہوا، اس نے وائسرائے میںٹو سے سیپریٹ الیکٹوریٹ کا مطالبہ کیا، کانگریس نے اس کی مخالفت کی، اس وقت کانگریس کے لیڈر محمد علی جناح نے بھی اس کی مخالفت کی، مسلمانوں کو سیپریٹ الیکٹوریٹ دینے کا مطلب یہ تھا کہ کچھ ایسی سیٹیں ہونگی جہاں صرف مسلمان کنڈیڈیٹ ہوگا اور مسلم ووٹرس اسے ووٹ کرسکیں گے، اور برٹش راج نے ۱۹۰۹ء میں انڈین کونسل ایکٹ کو منظوری دے کر اس کو حتمی شکل بھی دی، مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کو اپنے نمائندوں کے انتخاب کا حق دیا گیا، اس کو مورلی میںٹو ریفارمس کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، یہیں سے ''پھوٹ ڈالو اور راج کرو'' (ڈیوائڈ اینڈ رول) پالیسی کا آغاز ہوتا ہے۔

۲- ڈیوائڈ اینڈ رول پالیسی اور ہندو نیشنلزم کی بنیاد

برٹش راج کا ۱۹۰۹ء میں سیپریٹ الیکٹوریٹ کے لئے انڈین کونسل ایکٹ کو منظوری دینا دراصل ڈیوائڈ اینڈ رول پالیسی کا آغاز کرنا تھا۔

ڈیوائڈ اینڈ رول پالیسی کا دوسرا قدم ۱۹۱۹ء میں انڈین کونسل ایکٹ پاس کر کے اٹھایا، اور اس میں اس نے سکھ یورپین اور انڈین کو نمایندگی دی، ان اقدامات سے برٹش کی پالیسی ''پھوٹ ڈالو اور راج کرو'' برقرار رہی، اس کی وجہ سے الگ الگ دھرموں کے بیچ دراڑیں پڑنے لگیں، اسی بنیاد پر ہندو نیشنلزم کی بنیاد پڑی، اور آل انڈیا مسلم لیگ کی طرح اکھل بھارتیا ھندو مہاسبھا کا قیام ہوا، اس کے بانی مدن موہن مالویہ تھے، اس کے بعد ۱۹۲۵ء میں کیشو بلی رام ہیڈگوار نے آر ایس ایس کی استھاپنا کی۔

۳- ہندو مسلم اختلافات کی وجہ

ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نااتفاقیوں کی ایک وجہ تو برٹش کی ڈیوائڈ اینڈ رول کی پالیسی تھی اور دوسری وجہ اسکولوں اور کالجوں کا نصاب تھا، برٹش اسکولوں میں جو تاریخ پڑھائی جاتی تھی وہ دراصل مسخ شدہ

تاریخ تھی، اس وقت اسکولوں میں یہ بتایا جاتا تھا کہ کیسے مسلم حکمراں ہندو راجاؤں سے جنگیں کرتے تھے، ان پر حملہ کرتے تھے اور ان کے زر و جائداد کو لوٹتے تھے، آج اسی طرز کو تقریبا اپنایا جا چکا ہے، اسکولوں میں بچوں کو مسخ شدہ تاریخ پڑھائی جاتی ہے، مسلم تاریخ پر مبنی چیپٹرس کو یا تو نصاب سے خارج کر دیا گیا ہے یا پھر اس میں تبدیلی کر دی گئی ہے، یا پھر مسلم حکمرانوں کو ظالم بتایا گیا ہے۔

۱۹۰۹ء میں ایک انڈین میڈکل سیروس آفیسر لیفٹی ننینٹ کولونل او پندر ناتھ مکھر جی نے کچھ لیٹرس کلکتہ نیوز پیپر میں لکھے، ان خطوط کا عنوان تھا: 'Hindus:A Dying Race' (۱۹۲۹ء میں بھاسکر مکھر جی نے اس کو چھاپا اور ۲۰۱۱ء میں اس کو ڈیجٹل کیا) جس کا مطلب تھا کہ ہندو خطرے میں ہیں، انہوں نے اس میں لکھا کہ مسلمانوں کی آبادی بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے اور کچھ سالوں میں مسلمان ہندوؤں سے زیادہ ہو جائیں گے، ۱۹۲۰ء میں یہی ڈر فسادات میں تبدیل ہوا، ملک بھارت نے کئی خونی فساد دیکھے، بے شمار جانیں گئیں، بچے یتیم اور عورتیں بیوہ ہوئیں۔

ونایک دامودر ساورکر ہندوازم کی ایک مشہور شخصیت ہیں، ہندتو کا لفظ انہیں کی تخلیق ہے، جناح ہی کی طرح انہوں نے سیپریٹ الیکٹوریٹ کے خلاف احتجاج کیا، ان کا احتجاج کافی پر تشدد تھا، انہوں نے مدن لال ڈھگرا کو اکسایا کہ وہ ایک برٹش آفیسر کا قتل کریں اور اس نے ناسک کے کلکٹر کو قتل کرنے کی غرض سے Anand Laxman کو اسلحے بھی فراہم کئے تھے، اس کو گرفتار کرلیا گیا، اور کالے پانی کی سزا ملی، سزا سے چھٹکارہ کے لئے انہوں نے سرکار کو Mercy Petition لکھی اور رحم کی مانگ کی، اس طرح اگلے دس سالوں میں انہوں نے ۶/ Mercy Petitions لکھیں ان میں دو ان کے اہل خانہ نے دی تھیں، اس پٹیشن کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا پیش کرتا ہوں:

> By keeping me in jail nothing can be got in comparison to what would be otherwise. The mighty alone can afford to be the merciful and therefore where else can the prodigal son return but to the parental doors of the Government?(۱)

انہوں نے حکومت برطانیہ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ حکومت کے خلاف کوئی کام نہیں کریں گے، ان

Source: Penal Settlement Andaman-By: Ramesh Chandra Majumdar (۱)

درخواستوں کو منظوری ملی اوران کو رتنا گیری جیل میں ڈالا گیا، ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۴ء تک یہاں رہنا پڑا، برطانوی حکومت سے اپنے کئے گئے وعدوں کوانہوں نے خوب نبھایا اور ۱۹۲۳ میں Essentials of Hindutva کے نام سے ایک کتاب لکھی، ساورکر خود تو ملحد تھے، ان کے لئے ہندتو ایک Political Ideology تھی، یہ ہٹلر کے ایک فین بوائی تھے، نازی ازم جس طرح Pure German Aryan Blood کی بات کرتا تھا اسی طرح ساورکر ہندتو میں Pure Hindu Blood کی بات کرتے تھے، ہندو، سکھ، جین اور بدھسٹ سب ان کی ہندو کی تعریف میں آتے تھے، مسلمان اور عیسائی اس تعریف سے باہر تھے۔ اس کا ذکر اس لئے کیا تاکہ ہندو نیشنل ازم کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

۴۔ نیشنل ازم کا آغاز اور دیش کا بٹوارہ

۱۹۳۰ء کے آتے آتے تین طرح کی قومیت ابھر کر آئی، ہندو نیشنل ازم، مسلم نیشنل ازم اور انڈین نیشنل ازم، دیش کا بٹوارہ دراصل انہیں تین کے درمیان Struggle کی کہانی ہے۔

مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، سردار پٹیل، مولانا آزاد، سبھاش چندر بوس، لال بہادر شاستری، پرکاش نارائن اور بھگت سنگھ مانتے تھے کہ دھرم کے نام پر لوگوں کو نہ باٹا جائے، وہ قومی یکجہتی پر یقین رکھتے تھے، سبھاش چندر بوس جب کانگریس کے صدر بنے تو انہوں نے اس کی ممبرشپ کے لئے شرط لگائی کہ اگر کوئی ہندو مہا سبھا اور مسلم لیگ کا ممبر ہے تو وہ کانگریس کا ممبر نہیں بن سکتا، بھگت سنگھ نے اپنی بھارت نوجوان سبھا کے مینی فیسٹو میں یہ کنڈیشن رکھی کہ اگر کسی کا تعلق فرقہ واریت یا اس جیسی تنظیم سے ہے تو وہ بھارت نوجوان سبھا کا ممبر نہیں بن سکتا۔ یہ سب لوگ انڈین نیشنل ازم کے قائل تھے، یہ مانتے تھے کہ دھرم ملک سے اوپر نہیں ہے۔

مسلم نیشنل ازم کے حامیوں میں ایک بڑا نام رحمت علی کا ہے انہوں نے جنوری ۱۹۳۳ء میں ایک پمفلیٹ شائع کیا جس کا عنوان اور یہ نعرہ یہ تھا کہ:

'ابھی نہیں تو کبھی نہیں'

Now or Never; Are We to Live or Perish Forever?

انہوں نے مطالبہ کیا کہ بھارت کے پانچ شمالی پرونسز پنجاب، افغان، کشمیر، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک الگ ملک بنانا چاہئے۔ اور یہ انڈین فیڈریشن سے آزاد ہوں۔(۱)

---

(۱) تاریخ تحریک آزادی ہند از ہاشم قدوائی، ص: ۵۶۷

۱۹۳۳ء میں Statesman کلکتہ، جون ۱۹۳۴ء Eastern Times اور ۱۹۳۵ء میں لاہور کے Tribune نے پاکستان کے تصور پر تبصرہ کیا،۱۹۳۹ء میں سکندر حیات نے بھی ایک تجویز رکھی کہ متحدہ ہندوستان کو ایک کمزور وفاق کے تحت مختلف حلقوں میں تقسیم کر دیا جائے، اس کے علاوہ متعدد اسکیمیں پیش ہوئیں،ان میں سرفہرست حیدرآباد کے ڈاکٹر عبداللطیف،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر ظفرالحسن اور افضال قادری، پنجاب کے شاہ نواز خان اور عبداللہ ہارون وغیرہ کی اسکیمیں تھیں، ان سب اسکیموں میں پورے ہندوستان کو ایک مرکزی حکومت کے تحت تسلیم کیا گیا تھا لیکن اس کو بہت کم اختیارات دینے کی بات کہی گئی تھی، اور صوبوں کو پوری خودمختاری عطا کی گئی تھی۔

۵-راستے الگ ہوئے (الف)-The Parting of Ways

۱۹۲۰ء کا سال ہے،خلافت تحریک شروع ہو چکی ہے،اس تحریک کو مضبوط بنانے لئے عدم تعاون یعنی Non-co-Operation کا آغاز ہوا،کلکتہ کانفرنس میں عدم تعاون ریزولیوشن پاس ہوا،سی آر داس اور جناح اس کے مخالف ہوئے، مہاتما نے پورے ملک کا دورہ کیا، ۲۰؍دسمبر ۱۹۲۰ء میں اس تحریک عدم تعاون کے نظریئے پر تبادلہ خیال کرنے لئے ناگپور میں ایک اہم اجلاس ہوا، جناح نے اس کی مخالفت میں تقریر کی، حاضرین نے جناح کے لئے شیم شیم (Shame Shame) کے نعرہ لگائے، جناح فوراً اس مجلس سے چلے گئے بلکہ رات ہی میں ناگپور بھی چھوڑ دیا، اس طرح جناح کے تنظیمی Career کا اس کانگریس سے اختتام ہوا جس کی صف اول کے لیڈر وہ پچھلی دو دہائیوں تک رہے تھے۔(۱)

ناگپور اجلاس کی منظر کشی کرتے ہوئے ایس واپوٹ اپنی کتاب Jinaah of Pakistan (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس دہلی) میں لکھتے ہیں:

> جناح کو ستیہ گرہ تحریک کے معاملے میں گستاخانہ سلوک سے دوچار ہونا پڑا۔ان کو شیم شیم اور سیاسی ٹھگ (Political imposter) کی آوازوں کے بیچ چپ ہو جانا پڑا ،واپوٹ کے مطابق یہی سیاست میں جناح کی نیشنلسٹ زندگی (Nationalist career) کا اختتام تھا۔

گاندھی جی کے پیروں اور متبعین کے تبصروں نے بھی ملک کی تقسیم میں ایک اہم رول ادا کیا۔

---

(۱) قائداعظم محمد علی جناح اور پاکستان

بندو پادھیائے نے ہندوستان کے دو عظیم رہنماؤں یعنی گاندھی جی اور جناح کے افکار کا اکسرے (X-Ray) کرنے کی کوشش کی ہے:

> ناگپور اجلاس سے کچھ دنوں پہلے گاندھی جی نے جناح اور دوسرے لوگوں (جنہوں نے جناح کے ساتھ ہوم رول لیگ سے استعفے دے دیا تھا) سے اپیل کی کہ وہ عدم تعاون کی تحریک میں شامل ہو جائیں، تو جناح نے جواب دیا، میں آپ کی اس تجویز کے لئے شکریہ ادا کرتا ہوں جو آپ نے میرے لئے رکھی ہے کہ میں ملک میں جو نئی زندگی آئی ہے، اس میں حصہ لوں۔ اگر نئی زندگی سے آپ کی مراد آپ کے طریقوں سے اور آپ کے پروگراموں سے ہے تو معاف کیجئے کہ میں انہیں قبول نہیں کر سکتا کیونکہ مجھے پورا یقین ہے کہ یہ تباہی و بربادی کی طرف لے جائیں گے آپ کے طریقوں نے پہلے ہی ان تنظیموں میں جن کو آپ نے اب تک ہاتھ لگایا ہے تقسیم اور دراڑ پیدا کی ہے اور ملک کی عوامی زندگی (Public life) میں بھی، نہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بلکہ ہندو اور ہندو کے درمیان، مسلمان اور مسلمان کے درمیان بھی یہاں تک کے باپ اور بیٹے میں بھی، ملک کے طول وعرض میں لوگ عمومی طور پر بے اطمینانی اور مایوسی کی کیفیت میں پڑے ہوئے ہیں، آپ کے انتہا پسندانہ اقدام نے ناتجربہ کار نوجوانوں، سادہ لوحوں اور ان پڑھوں کے دماغ کو متاثر کیا ہے، ان سب کا مطلب ہے انتشار اور افراتفری (Disorganization & chaos) ،انجام اس کا کیا ہوگا، اس خیال سے میں کانپ جاتا ہوں، نیشنلسٹوں کے لئے ایک ہی راستہ ہے کہ وہ متحد ہو جائیں اور ایسے پروگراموں پر کام کریں جسے سب قبول کرلیں اور وہ ہے مکمل خود مختار حکومت (Self Government) کا جلد حصول۔ ایسا پروگرام کسی ایک فرد کی تحکمانہ ہدایت (dictation) پر نہیں ہوسکتا ہے؛ بلکہ اسے ملک کے سارے اہم نیشنلسٹ لیڈروں کی حمایت اور قبولیت حاصل ہونی چاہیے اور اس مقصد کے لئے مجھے یقین ہے کہ میں اور

میرے رفقاء ہمہ تن تیار اور کار بند رہیں گئے۔(۱)

۶-مسلمانوں کے متعلق گاندھی جی کا تبصرہ

مولانا محمد علی نے مہاتما گاندھی سے مدن موہن مالویہ (جو ایک مقتدر ہندو لیڈر تھے اور برٹش راج سے جن کے نزدیکی کے تعلقات تھے) کے مسلم مخالف رویہ کے بارے میں شکایت کی، تو گاندھی جی نے جواب دیا میرا اپنا تجربہ اس رائے کی تصدیق کرتا ہے کہ مسلمان عمومی طور پر bully (دنگائی، دھونسیا) ہوتا ہے اور ہندو بزدل۔ اور جہاں ڈرپوک ہوں وہاں bully ضرور ہوں گے، سیروائی اس پر کہتے ہیں اگر ناظرین مہاتما گاندھی کے اس ریمارک سے یہ نتیجہ نکالیں کہ وہ (یعنی گاندھی جی) Bullies اور ڈرپوک کے درمیان (اصلاً) اتحاد قائم کرنا نہیں چاہتے تھے تو وہ کچھ زیادہ غلطی پر نہیں ہوں گے۔''

۷-موپلا مسلمانوں کی بغاوت

ہندوستان کے مغربی ساحل پر مالابار علاقے میں موپلا نامی ایک آدی باسی فرقہ بستا تھا جو شروع میں ہی مشرف بہ اسلام ہو گیا تھا تاہم موپلاؤں میں tribal یعنی قبائلی خصوصیات باقی تھیں، مثلاً گروہی یک جہتی۔ ضد اور اڑیل پن۔ چنانچہ جب خلافت کی تحریک چلی (یعنی ترکوں کو انگریزوں نے جو زک پہونچائی تھی اس پر احتجاج والی تحریک) تو Mopla موپلا مسلمانوں نے اس کا کچھ زیادہ ہی اثر لیا تھا اور انگریزی حکومت کے خلاف انہوں نے ۱۹۲۱ء میں علم بغاوت بلند کر دیا، اس شورش کو (برٹش) حکومت ہند نے بڑی سختی سے دبایا اور بڑے مظالم ڈھائے رام گوپال نے اپنی کتاب ''انڈین مسلم'' میں لکھا ہے کہ موپلاؤں کی بغاوت کو اس علاقے میں تعینات مقامی فورس سے دبایا نہیں جا سکا تو ہمالیہ اور برما سے فوجی ٹکڑے بلائے گئے۔ گورکھا، گڑھوالی کو لگایا گیا جن کے سینوں میں اسلام کے لئے کوئی نرم گوشہ نہیں ہو سکتا تھا۔

رام گوپال ہی کے مطابق شورش کو دبانے کے سلسلے میں ۲۲۶۶ رموپلا مارے گئے، ۶۱۵ ر زخمی ہوئے، ۵۶۸۸ ر پکڑے گئے اور ۳۸۲۵۶ ر نے خود سپردگی کی۔ ایک خاص واقعہ میں ۷۰ ر ستر موپلاؤں کو (کچھ رپورٹوں کے مطابق ۱۰۰) ایک مال گاڑی کے ڈبے میں بند کر کے کالی کٹ سے مدراس لے جایا جارہا تھا، جب ڈبے کو پودنور ریلوے اسٹیشن پر کھولا گیا تو ۶۶ چھیاسٹھ آدمی مر چکے تھے اور باقی بدترین حالت میں تھے۔

(۱) انگریزی سے ترجمہ- بندو پادھیائے، ص: ۴۴

اس طرح موپلاؤں کو زیر کرنے میں کچھ فرقہ وارانہ عنصر بھی آ گیا تھا اور کچھ انگریزوں نے انہیں بدنام کرنے کے لئے الزام لگادیئے کہ موپلاؤں نے علاقے میں ہندو آبادی پر بھی حملے کئے اور زور زبردستی سے لوگوں کو مسلمان بنایا، انگریزوں کے اس الزام نے ہندی پریس میں افواہوں کا بازار گرم دیا، موپلا تو ابتدائی دور میں مقامی آبادی سے مذہب تبدیل کر کے مسلمان بنے ہی تھے اور بعد میں بھی اشاعت اسلام کا کام صرف مالا بار ہی میں نہیں بلکہ پورے ہندوستان میں ہوتا ہی رہا تھا، لہٰذا عدم اعتمادی کے دور میں یہ کہہ دینا کہ بہت سارے ہندوؤں کو زور زبردستی مسلمان بنایا گیا، کوئی ایسا مشکل کام بھی نہیں تھا؛ لیکن یہ الزام صحیح نہیں تھا اور جیسا کہ بندو پادھیائے نے اپنی کتاب میں لکھا ہے حسرت موہانی جیسے سیکولر اور کانگریسی شخص نے بھی اس الزام کو پورے طور پر مسترد کیا۔

تاہم اس شوشے کو لیکر چل سنگٹھن تحریک کا قیام ہوا، اس تحریک کا مقصد اور نعرہ تھا کہ ہندوؤں کو منظم کرو تا کہ ان کے درمیان ذات پات کی نسبت سے جو منافرت آپس میں پائی جاتی ہے وہ ختم ہو اور مسلمان کے مقابلے میں ہندو ایک طاقت بنے رہیں، سنگٹھن تحریک کے بانی پنڈت مدن موہن مالویہ تھے، سنگٹھن تحریک سے پہلے یہ کامل شدھی تحریک کرتی تھی، اس کا مقصد تھا ہندو سے مسلمان ہو گئے لوگوں کو پھر ہندو بنانا اور اس کی قیادت سوامی دیانند سرسوتی کر رہے تھے۔

۱۹۳۹ء میں انگلینڈ جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کرتا ہے، اور جنگ عظیم دوم کی شروعات ہوتی ہے، انڈیا کا وائسرائے لنلتھ گو یہ اعلان کرتا ہے کہ انڈیا بھی جرمنی کے خلاف لڑے گا، لیکن کانگریس مخالفت کرتی ہے، کانگریس مشروط شرکت کی بات کرتی ہے؛ لیکن لنلتھ گو اس شرط کو ماننے سے انکار کر دیتا ہے اور لنلتھ گو کی ساورکر مدد کرتے ہیں اور برٹش راج کو ایک خط لکھتے ہیں جس میں وہ ہندو مہاسبھا کے لئے ایک ڈومنین اسٹیٹس کا مطالبہ کرتے ہیں:

> His Majesty's government must now turn to the Hindus and work with their support. Our interests were now the same and we must therefore work together...... Our interests are so closely bound together, the essential thing is for Hinduism and Great Britain to be friends and the old antagonism was no longer necessary. The Hindu Mahasabha he went on to say favoured an

unambiguous undertaking of Dominion status at the end of the war.(۱)

پاکستان کے مطالبہ کو حتمی شکل QIM کا آغاز

۲۳/ مارچ ۱۹۴۰ء کے لاہور سیشن میں پاکستان کی مانگ کو حتمی شکل دے دی جاتی ہے، قرار داد پاکستان کو بہادر یار جنگ پڑھ کر سناتے ہیں، آل انڈیا آزاد کانفرنس اس کے خلاف احتجاج کرتی اور پاکستان مردہ باد کے نعرہ لگائے جاتے ہیں، اس درمیان آل پارٹی یونٹ کی بھی بات ہوتی ہے؛ لیکن کامیابی نہیں ملتی، ۱۹۴۲ء میں گاندھی جی Quit India Movement کا آغاز کیا اور قومیت پسند لوگوں نے سرے سے اس کا بائکاٹ کیا اور ساور کر نے تو حکومت برطانیہ اس کے متعلق خط بھی لکھا جس میں انہوں نے مہاسبھا کے ممبروں کو برٹش آرمی کے ساتھ شریک ہونے کے لئے ابھارا۔

Hindu Mahasabha openly opposed the call for the Quit India Movement and boycotted it officially. Savarkar even went to the extent of writing a letter titled"Stick to your Posts", in which he instructed Hindu Sabhaites who happened to be "members of municipalities, local bodies, legislatures or those serving in the army...to stick to their posts" across the country, and not to join the Quit India Movement at any cost.(۲)

۲۱/ اکتوبر ۱۹۴۳ء میں سبھاش چندر بوس نے آزاد ہند فوج (انڈین نیشنل آرمی) کی بنیاد ڈالی، اس نے برطانوی طاقتوں کے خلاف لڑنے میں اہم کردار ادا کیا، دوسری جنگ عظیم میں سبھاش چندر بوس نے جاپان کا ساتھ دیا تو ساور کر نے اس کی زبردست مخالفت کی۔

Savarkar Stood with British Imperialists against Subhash Chandra Bose

To what extent Savarkar was willing to help the British would be clear by the following words of his: So far as India's defence is concerned, Hindudom must

(۱) Published in 'The Wire' on May 28, 2017

(۲) https: abhipedia.abhimanu.com Article IAS NDE3MQEEQQVVEEQQVV Opposition-to-Quit-India-movement-Indian-History-IAS

> ally unhesitatingly,in a spirit of responsive co-operation with the war effort of the Indian government in so far as it is consistent with the Hindu interests, by joining the Army, Navy and the Aerial forces in as large a number as possible and by securing an entry into all ordnance, ammunition and war craft factories.... Again it fmust be noted that Japan's entry into the war has exposed us directly and immediately to the attack by Britain's enemies. Consequently, whether we like it or not, we shall have to defend our own hearth and home against the ravages of the war and this can only be done by intensifying the government's war effort to defend India. Hindu Mahasabhaits must,therefore, rouse Hindus especially in the provinces of Bengal and Assam as effectively as possible to enter the military forces of all arms without losing a single minute.(۱)

مذکورہ بالا چند حقائق سے اس وقت کے حالات کی منظری کشی ہوتی ہے، دونوں گروہوں کی اصل حالت کا پتہ چلتا ہے، ملک کی تقسیم میں کن کن جماعتوں اور شخصیتوں کا اہم رول ہے اس سے پردہ اٹھتا ہے، یہ حقیقت ہے ہندو قوم تنگ نظری کا شکار تھی، انڈین نیشنل کانگریس اس تنگ نظری کو پروان چڑھانے میں پیش پیش رہی، ہندو احیائی اور ہندوتو وادی تحریکوں نے مسلمانوں کے خلاف سادہ لوح اور ان پڑھ لوگوں کو مشتعل کرنے اور ان کے جذبات کو جلا بخشنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا، برٹش راج نے بھی موقع سے خوب فائدہ اٹھایا، وہ شہرت اور طاقت کے لالچیوں کو پالتی رہی اور 'پھوٹ ڈالو اور راج کرو' کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے دونوں کو ایک دوسرے لڑاتی رہی، جب دونوں اپنے آپ کو ایک دوسرے سے غیر محفوظ سمجھنے لگے اور ہندؤوں نے انگریزوں کی پشت پناہی میں ظلم کرنا شروع کر دیا تو مسلمانوں نے بھی اپنے تحفظ کی کوشش اور سماجی اور تعلیمی ترقی کے لئے کوشش کی، سیاسی حقوق کے حصول کے لئے انہوں فورم اور پلیٹ فارم بنایا اور بعد میں اسی پلیٹ فارم سے تقسیم کا بھی مطالبہ ہوا۔

Savarkar Myths and Facts by: Shamsul Islam 2006 (۱)

بالآخر ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو ملک بھارت دو حصوں میں تقسیم ہو گیا، تقسیم کا فیصلہ اس سے کئی مہینہ پہلے لیا جا چکا تھا، ۱۵ر جولائی ۱۹۴۷ء کو برٹش پارلیمنٹ نے انڈین انڈیپینڈینس ایکٹ پاس کیا اور ۱۸ر جولائی ۱۹۴۷ء کو برطانیہ کنگ نے انڈین انڈیپینڈینس ایکٹ کو نافذ کر کے تقسیم کی حمایت کی؛ لیکن اس سے بھی پہلے ۳ر جون ۱۹۴۷ء کو لوئس ماؤنٹ بیٹن نے تقسیم کے منصوبہ کو ریڈیو پر نشر کیا تھا، اس کو ماونٹ بیٹن پلان کہا جاتا تھا، کانگریس لیڈر سردار پٹیل اور جواہر لال نہرو نے تقسیم ہند منصوبہ کو ۳ر جون ۱۹۴۷ء کو ہی قبول کر لیا یہ دلیل دیتے ہوئے کہ بھارت کی تقسیم کوئی بھی نہیں چاہے گا؛ لیکن اگر اس تقسیم کے منصوبہ پر عمل درآمد نہ ہوا تو بھارت کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے گا، تقسیم کے نتیجہ میں خون خرابہ ہوا، اگست ۱۹۴۷ء سے ۱۹۴۸ء تک لوگوں کی منتقلی ہوتی رہی، 5.4 ملین لوگ پاکستان سے بھارت آنے پر مجبور ہوئے، ۶ر ملین مسلمانوں کو پاکستان کی طرف ہجرت کرنا پڑا، ۱۰ر ملین بے گھر ہوئے اور ایک ر ملین لوگ مارے گئے۔

تقسیم سے متعلق تاریخیں، واقعات اور مختصر معلومات

۱۸۸۲ء: بنکم چندر چٹرجی کا آنند مٹھ ناول جس میں انہوں نے بندماترم کو شامل کیا۔

۱۸۸۵ء: مسٹر ایچ ایم ہیوم نے انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد ڈالی۔

۱۸۹۲ء: برطانوی حکومت نے ہندوستانیوں کو حکومت میں شراکت کے لئے انڈین کونسل ایکٹ کو منظوری دی۔

۱۹۰۵ء: لارڈ کرزن نے بنگال کی تقسیم کی، اور جناح کانگریس میں شامل ہوئے۔

۱۹۰۶ء: سر آغا خان کی سرکردگی میں میں ۳۵ افراد پر مشتمل ایک ڈیلیگیشن وائسرائے سے شملہ میں ملا، ہندوستان میں مسلمانوں کے مسائل (بالخصوص اکثریتی ہندو فرقہ کے تعلق سے مشکلات) کو گوش گزار کرایا اور اس کے لب لباب کو ایک انگریزی کے جملہ Unsympathetic Majority سے تاویل کیا گیا۔ (اکتوبر)

۱۹۰۶ء: آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد ڈھاکہ میں پڑی۔

۱۹۰۹ء: انڈین کاؤنسلس ایکٹ پاس ہوا جس کی رو سے مسلمانوں کے لئے سیپریٹ الیکٹوریٹ (علیحدہ نظام انتخاب) کا پرویژن دیا گیا۔

۱۹۱۱ء: میں بنگال کی تقسیم کو کالعدم قرار دیا گیا۔

۱۹۱۴ء: میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی اور مسز اینی بسنٹ نے ہوم رول لیگ کی بنیاد ڈالی۔

۱۹۱۶ء: کانگریس اور مسلم لیگ کے مابین لکھنؤ معاہدہ، جس میں علیحدہ نظام انتخاب کو تسلیم کیا گیا۔

۱۹۱۹ء: گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پاس ہوا جو حکومتی انتظامیہ میں انڈین کی شراکت کے لئے تھا۔

۱۹۲۰ء: جناح نے رسمی طور پر کانگریس سے کنارہ کشی اختیار کر لی، اور عدم تعاون تحریک پر تبادلہ خیال کے سلسلہ میں ناگپور میں اجلاس منعقد ہوا۔

۱۹۲۱ء: موپلاؤں کی بغاوت اور اس کے بعد ہندو تنظیم سنگٹھن کا قیام۔

۱۹۲۷ء: ۲۰ / مارچ (موتی لال) نہرو رپورٹ کی تیاری سے پہلے مسلمانوں کی اس میں شرکت اوران کے شرائط کو طے کرنے کے لئے دہلی میں مسلمانوں کی ایک میٹنگ میں تجویزات مرتب کی گئیں جنہیں Delhi Muslim Perposals کے نام سے جانا جاتا ہے۔

۱۹۳۰ء: انگلینڈ میں پہلی گول میز کانفرنس، اسی درمیان چودھری رحمت علی نے ایک پمفلٹ شائع کیا اور پاکستان کا خاکہ پیش کیا۔

۱۹۳۰ء: علامہ اقبال نے مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کی اور ہندوستان کے شمال مغربی مسلم اکثریت والے خطوں میں ایک الگ مسلم مملکت کا تخیل پیش کیا جو ہندوستان کے وفاق کے تحت ہو، اسی بنیاد پر علامہ اقبال کو بعض لوگ پاکستان کا اصل بانی گردانتے ہیں۔

۱۹۳۱ء: دوسری گول میز کانفرنس لندن میں۔ اسی دوران میں انڈین ایکسپریس کے ایڈیٹر فرینک موریس نے جناح سے لفظ پاکستان کی تفصیل چاہی تو جناح نے اس تخیل کا مذاق اڑایا۔

۱۹۳۳ء: تیسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس لندن میں۔

۱۹۳۷ء: گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ کے تحت صوبائی اسمبلی انتخابات ہوئے، یوپی میں

کانگریس نے اپنے وعدہ کے خلاف مسلم لیگ کو منسٹری میں لینے سے انکار کیا، نتیجتاً مسلم لیگ اور کانگریس سے مفاہمت کی ساری راہیں مسدود ہو کر رہ گئیں۔

۱۹۳۹ء: وائسرائے نے دوسری جنگ عظیم کے سلسلہ میں ہندوستان کے لئے جرمنی کے خلاف ایک فریق ہونے کا اعلان کیا۔

۱۹۳۹ء: مولانا آزاد کانگریس صدر بنے۔

۱۹۴۰ء: لاہور کے مسلم لیگ کے اجلاس میں مشہور لاہور رزولیوشن پاس ہوا۔

۱۹۴۵ء: ڈیسائی لیاقت معاہدہ پر دستخط ہوئے جس میں مرکزی ایکزیکٹیو اور مرکزی لیجیس لیچر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ برابر برابر کا اصول تسلیم کیا گیا۔

۱۹۴۵ء: مولانا آزاد نے اپنا مشہور خط گاندھی جی کے نام لکھا جس میں ہندوستان میں ایک وفاقی طرز کی حکومت کی تجویز تھی اور سنٹرل لیجیس لیچر اور ایکزیکیٹیو میں برابری کی تجویز کی گئی تھی، اس خط کا جواب گاندھی جی نے بہت تیکھے الفاظ میں دیا تھا اور ٹیلی گرام کے ذریعہ ہدایت کی تھی کہ اس خط کو شائع نہ کیا جائے۔

۱۹۴۶ء: مارچ/ کیبنٹ مشن ہندوستان پہنچا۔

۱۹۴۶ء: مولانا آزاد نے اپنے ایک اہم بیانیہ کو شائع کیا جس میں پاکستان کو رد کرتے ہوئے ہندو مسلم مسائل کے حل کے لئے اہم تجویزیں تھیں اور وہی بنیاد بنیں ان اہم امور کی جو انہوں نے کیبنٹ مشن کو کانگریس کے صدر کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔

۱۹۴۶ء: لارڈ ویویل نے حکومت برطانیہ کو برطانوی لوگوں کو ہندوستان سے واپس کے لئے ایک پلان پیش کیا جسے Break Down Plan کہا جاتا ہے۔

۱۹۴۶ء: دسمبر ۹/ دستور ساز اسمبلی کی پہلی بیٹھک (مسلم لیگ اس میں شامل نہیں)۔

۱۹۴۷ء: جنوری ۲۰/ دستور ساز اسمبلی کی دوسری نشست (مسلم لیگ شامل نہیں)۔

۱۹۴۷ء: فروری ۲۰/ پرائم منسٹر ایٹلی نے ہاؤس آف کامنس میں یہ اعلان کیا کہ اختیارات کی منتقلی کسی ایسی تاریخ میں یقینی طور پر کردی جائے گی جو ۱۹۴۸ء سے پہلے ہوگی۔

۱۹۴۷ء: مارچ ۵/اختیارات کی منتقلی والے بیانیہ پر کانگریس ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ ہوئی اور پنجاب کی تقسیم کے لئے رزولیوشن پاس کیا۔

۱۹۴۷ء: ماونٹ بیٹن کی ہندوستان آمد۔

۱۹۴۷ء: مئی ۳۱/ماونٹ بیٹن لندن سے منظور شدہ Partition پلان کو لے کر دہلی واپس آئے۔

۱۹۴۷ء: جون ۲/دہلی میں بیٹن نے پارٹیشن کی تفصیلات اہم لیڈروں کو ایک بتائیں اور شام کو کانگریس کی ورکنگ کمیٹی میں اس پلان کو منظور کیا گیا۔

۱۹۴۷ء: جون ۳/بیٹن پلان کا اعلان باضابطہ ایک ہی ساتھ دہلی اور لندن میں کیا گیا۔

۱۹۴۷ء: جون ۴/روائسرائے نے ایک پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ اختیارت کی منتقلی اب ۱۵/اگست کو ہی ہوگی۔

۱۹۴۷ء: جولائی ۱۵/انڈین انڈپینڈینس ایکٹ پاس اور ۱۸/جولائی ۱۹۴۷ء سے نافذ العمل ہوا۔

۱۹۴۷ء: اگست ۱۴/۱۹۴۷ء کو ہندوستان تقسیم ہوا اور پاکستان وجود میں آگیا۔

○○○

تحریک آزادی میں اردو زبان کا حصہ

مولانا محمد خالد ندوی ❖

دنیا بھر کے انسانی معاشروں کی ذہنی وفکری ساخت کی تشکیل میں ادباء، شعراء اور مفکرین کی قلمی جولانیوں کا بڑا اہم کردار رہا ہے، اسی طرح دنیا میں جتنے بڑے انقلابات رونما ہوئے ہیں ان کی ماحول سازی اورتخم ریزی میں قلمکاروں، شاعروں، صحافیوں اور خطیبوں نے بنیادی رول ادا کیا ہے، آزادی وانقلاب کی تحریکات میں زبان وادب کی نہ صرف یہ کہ نظریاتی وفکری اہمیت ہے بلکہ عملی جدوجہد اور زمینی کوششوں میں بھی قلم ایک مضبوط ہتھیار ثابت ہوتا ہے، بھارت کی تحریک آزادی میں بھی اردو کے ادباء، شعراء اور صحافیوں نے برطانوی استعمار کی بنیادیں ہلا ڈالیں، اور انگریزی ایوانوں میں ایک زلزلہ برپا کردیا، عوام کے ذہن ودماغ میں آزادی کی امنگ پیدا کردی۔

آزادی کے متوالوں میں جوش بھر رہا تھا تحریک آزادی زور پکڑ رہی تھی، جس کے نتیجہ میں صحافیوں، مصنّفین اور قائدین کو قید وبند کی صعوبتوں سے بھی گزرنا پڑا؛ لیکن شمع آزادی کے پروانے ان بندشوں کو کہاں خاطر میں لانے والے تھے! فضائیں 'انقلاب زندہ باد' کے نعروں سے گونجنے لگیں، اور 'سرفروشی کی تمنا' کی آواز ہر دل کی صدا بن گئی، اس وقت اخبار ورسائل نے بھی اپنی ذمہ داری نبھائی اور لوگوں میں آزادی کا جذبہ پیدا کیا، مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا آزادؒ، مولانا حسرت موہانیؒ اور امامِ انقلاب مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی تقریروں نے تحریک آزادی میں جو کردار ادا کیا اسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

اگرچہ اٹھارہویں صدی میں برعظیم کے وسیع علاقے میں اردو بولی جاتی تھی؛ لیکن اس باوجود فارسی زبان علمی اور ادبی حلقوں میں مقبول تھی اور علمی شہ پارے اسی زبان میں لکھے جاتے تھے، جب ایسٹ انڈیا کمپنی کو اس براعظم کے وسیع خطوں میں عمل دخل حاصل ہوا تو اس نے اپنے استحکام کے لئے یہ ضروری خیال کیا کہ جو

❖ فاضل المعهد العالي الاسلامي حیدرآباد

سماجی اور ثقافتی علامات پرانے نظام کی یاد تازہ کرتی ہیں، انہیں آہستہ آہستہ ختم کردیا جائے، بقول محمد عتیق صدیقی:

> ''انیسویں صدی کے اوائل میں ہی ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں عملاً وہ مرکزی حیثیت حاصل کرلی تھی جو اب تک اس ملک میں مغل حکمرانوں کی تھی، اپنی اس امتیازی حیثیت کوظاہر کرنے کے لئے کمپنی نے یہ ضروری سمجھا کہ فارسی زبان کی سرکاری حیثیت ختم کردی جائے جو مغل دور کی یادگار تھی، چنانچہ 1830ء میں فارسی کی جگہ اردو سرکاری زبان قرار دی گئی، ایسٹ انڈیا کمپنی کے اس اقدام کا قدرتاً اردو کی نشونما پر خوشگوار اثر ہوا، عدالتوں میں فارسی کی جگہ اب اردو میں کام ہونے لگا اور اس کے ساتھ ہی اردو زبان کے اخباروں کی تعداد بھی تیزی سے بڑھنے لگی۔''(۱)

1857ء کی جنگ آزادی میں اردو صحافت

1822ء میں کلکتہ سے شائع ہونے والے 'جامِ جہاں نما' کو اردو کا پہلا اخبار تسلیم کیا گیا ہے، جس کے مالک ہری ہردت اور مدیر سدا سکھ لعل تھے، بعضوں کا خیال ہے کہ 'مرآۃ الاخبار' اردو کا سب سے پہلا اخبار ہے جو 1821ء میں کلکتہ سے شائع ہوا، جس کے روح رواں راجا رام موہن رائے تھے، البتہ دیگر بعض محققین کی تحقیق ہے کہ اردو کا پہلا اخبار اٹھارہویں صدی کے اواخر میں 1794ء کے آس پاس میسور کے حکمراں ٹیپو سلطان نے جاری کیا اور اس کا نام 'فوجی اخبار' تھا، جو سرنگا پٹنم کے سرکاری پریس سے شائع ہوتا تھا۔

دہلی اردو اخبار

شمالی ہندوستان میں اردو اخبار نویسی کی ابتدا فروری 1837 میں 'دہلی اردو اخبار' کے اجراء سے ہوئی، مولوی محمد باقر کا اردو اخبار دہلی سے 1837 سے 1857 تک جاری رہا، 1857ء کی جنگ آزادی میں سرفروشانہ کردار ادا کرنے والے اخباروں میں سب سے نمایاں نام اسی اخبار کا ہے، اس اخبار کے مدیر مولوی محمد باقر تھے، جو مشہور ادیب وانشاء پرداز مولانا محمد حسین آزاد کے والد ہیں، مولوی محمد باقر کی حق گوئی وبے باکی

(۱) اردو صحافت اور جنگ آزادی 1857، از معصوم مرادآبادی: ۸۹-۹۰

مشہور تھی، جس کا اعتراف نہ صرف ان کے قارئین کو تھا بلکہ اس زمانہ کے سرکاری رپورٹ میں بھی ان کی تیزیٔ طبع پر حرف گیری کی گئی، یہ تحریک آزادی کے لئے شہید ہونے والے پہلے صحافی تھے۔

مولوی محمد باقر کو 'اردو کا پہلا صحافی' ہونے کا اعزاز حاصل ہے، انہوں نے نہ صرف برٹش حکومت کے خلاف بے باکانہ قلم اٹھایا بلکہ مغل بادشاہوں کی عیش پرستی اور نااہلی کو بھی بے نقاب کیا، اپنی تحریروں سے وطن پرستوں میں انہوں نے جرأتِ رندانہ پیدا کی، اور ان کے جذبۂ حریت اور شوقِ شہادت کو ابھارا، 'دہلی اردو اخبار' محض سیاسی خبروں کے لئے ہی خاص نہیں تھا بلکہ اس دور کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کا بھی بھرپور عکس اس میں دیکھنے کو ملتا ہے، بقول خواجہ احمد فاروقی:

> ''دہلی اردو اخبار شاہجہاں آباد دہلی کا پہلا اردو اخبار ہے، جس کے مطالعہ سے مومنؔ وغالبؔ، شیفتہ وآزردہؔ اور ذوقؔ وظفرؔ کا سارا ماحول اپنی پوری جلوہ سامانیوں کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے، اور ہم اس جامِ جم میں دو دنیاؤں کو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں جس میں ایک ابھرتی ہوئی ہے، دوسری ڈوبتی ہوئی۔''(۱)

1857ء کے انقلاب نے کیا تبدیلی پیدا کی تھی 'دہلی اردو اخبار' کے لہجہ میں ملاحظہ ہو، 31 مئی 1857 کے اخبار میں مولوی محمد باقر لکھتے ہیں:

> ''انگریزوں کے تکبر نے ان کو قہر الہی میں مبتلا کیا ہے۔ ان اللہ لا یحب المتکبرین۔ اب کہاں ہیں انگلش مین اور فرینڈ آف انڈیا.......اور وہ لن ترانیاں۔ حکمت وحکومت داناؤں انگلستانیوں کی.......''

انقلاب کا آغاز 10 رمئی کو میرٹھ کے سپاہیوں کی بغاوت سے ہوا، 11 رمئی کو یہ سپاہی دہلی پہنچے، جس کے بعد راجدھانی دہلی شورش وہنگامے کی لپیٹ میں آگئی، 17 رمئی کو ہفتہ وار 'دہلی اردو اخبار' کا شمارہ منظر عام پر آیا تو اس کے صفحات انقلاب کی خبروں سے پر تھے، صفحۂ اول پر انقلاب کی خبر عنوان اور اس کا ابتدائیہ قرآنی آیات سے شروع ہوا تھا، خبر کا عنوان تھا: ''قل فاعتبروا یا أولي الأبصار''، خبر کے آغاز جو قرآنی آیات درج تھیں اور بعد ازاں ایڈیٹر نے اپنی زبان میں جو تمہید باندھی تھی، اس میں خدا کی بزرگی وبرتری کے اعلان

(۱) مقدمہ 'دہلی اردو اخبار' از پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، ص:۱

اورعزت وذلت عطا کرنے میں اس کے بے پایاں اور لامحدود اختیارات کے اعتراف کے بعد انسانوں کی غفلت اور گمراہی کی طرف توجہ دلائی گئی اور پھر انگریزوں کی حکومت وطاقت کے خلاف ہونے والے عظیم معرکے کوموضوع بنایا گیا تھا، ملاحظہ ہو:

''وہ حکام ظاہرالاستحکام جن کے استقلال حکومت وانتظام کے زوال کا نہ ان کو خیال تھا اور نہ کسی غفّال کو وہم وگمان کبھی آ سکتا تھا، ایک طرفۃ العین میں وہ نمایاں ہوگیا۔''(۱)

اس اخبار میں گاہے گاہے انگریزی عملہ کی بدعنوانیاں، پولیس کی نااہلی وغیر ذمہ داری، ان کی مجرموں سے سازباز اور اسی طرح کے دوسرے عنوانات کے تحت سیاسی انتشار اور بے چینی کو ظاہر کیا جاتا تھا، اس زمانہ میں ہندو مسلم قومیت کے علاحدہ علاحدہ تصورات نمایاں طور پر ظاہر ہورہے تھے، اور اسی بنا پر فسادات اور تنازعات بھی جنم لے رہے تھے، انگریزوں نے ہر موقع پر اس قسم کی صورتِ حال سے فائدہ اٹھایا، چنانچہ اس موقع پر ان کی کارگزاریوں کو اس اخبار کی متعدد اشاعتوں میں برملا بیان کیا گیا تھا، اس اخبار نے کبھی کبھی اپنی اشاعتوں میں دہلی اور لکھنؤ کے ارباب حکومت کی غفلت شعاری اور غیر ذمہ داری کو بے نقاب کیا ہے، اور ایسے حکمرانوں کی تحسین کی ہے جو رعایا پرور اور مستعد تھے۔

صادق الاخبار

آزادی کی جدوجہد میں نمایاں طور پر حصہ لینے والے اخبارات میں ایک اہم اخبار 'صادق الاخبار' بھی تھا، جسے دہلی سے سید جمیل الدین خان نکالتے تھے، یہ دہلی کا سب سے بڑا اخبار تھا، نہ صرف دہلی میں پڑھا جاتا تھا بلکہ باہر بھی بھیجا جاتا تھا، جنگ آزادی جیسے جیسے سارے ملک میں پھیلتی جارہی تھی، ہندوستانیوں کے جذباتی ہیجان میں بھی اضافہ ہوتا جارہا تھا، اور وہ ہندوستانیوں کی فتح کے لئے پر امید ہورہے تھے، 'صادق الاخبار' اپنی اشاعت 3/اگست 1857ء کے اداریہ میں لکھتا ہے:

''گورے ہزاروں سب اطراف سے کھنچ کر آئے، فرنگیوں نے لاکھ تدبیر تسخیر دہلی کی کی، مگر نہ گوروں کی شجاعت یہاں کام آئی اور نہ تقدیر کے آگے کچھ تدبیر پیش گئی۔ جہاں تہاں وہ کفار (یعنی دشمن انگریز) گاجر کی طرح کاٹ اور ہر

(۱) اردو صحافت اور جنگ آزادی 1857، از معصوم مرادآبادی: ۱۰۲

ایک کھیت پر مولی کی مانن چھانٹے گئے۔ باقی جو قدرے قلیل میدان علی پور میں
ہیں، ان کو بھی عنقریب سن لیں گے کہ جاروب قہر الٰہی سے خس کم جہاں پاک
ہوئے اور شاہ گیتی پناہ کا تسلط تمام ہندوستان میں ہو گیا۔''(۱)

صادق الاخبار نے 1857ء کی جنگ آزادی میں عوامی جذبات کو ابھارنے اور حکومت برطانیہ کے خلاف رائے عامہ کو ہموار کرنے میں ایک نمایاں رول ادا کیا، اپنے تیز وتند اسلوب اور طاقتور لہجہ کی وجہ سے عوام وخاص میں مقبول اخبار تھا، بغاوت اکسانے کے الزام میں حکومت کی جانب سے اس پر متعدد مقدمے چلائے گئے اور اس کے ایڈیٹر جمیل الدین کو قید کی سزا تک ہوئی، جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ قلم کے یہ سپاہی صرف زبان کے جادوگر اور گفتار کے غازی نہیں تھے، بلکہ اپنی جدوجہد کے نتائج وانجام کا سامنا کرنے، قید وبند کی صعوبتوں کو برداشت کرنے حتیٰ کہ دار ورسن کو گلے لگانے سے بھی دریغ نہیں کیا کرتے تھے، اور غازیانِ شمشیر وسناں سے کاندھا ملا کر معرکۂ کشت وخوں میں بھی پیش پیش نظر آتے تھے، عتیق احمد صدیقی 1857ء کے اخبارات کا ذکر کرتے ہوئے 'صادق الاخبار' کے بارے میں لکھتے ہیں:

''دہلی کا سب سے زیادہ قابل ذکر اخبار 'صادق الاخبار' تھا، جس نے بغاوت
کے جذبات کی تخم ریزی میں حصہ لیا تھا اور جس نے بغاوت کے دوران باغیوں
کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کی تھی۔''(۲)

جہاد کا فتویٰ

صادق الاخبار نے 35/جید علمائے کرام دین کا وہ فتویٰ بھی شائع کیا تھا جس میں انگریزوں کے خلاف انقلابی سپاہیوں کی جنگ کو جہاد سے تشبیہ دی گئی تھی، یہ فتویٰ صادق الاخبار پنجم ماہ ذی الحجہ 1273 ہجری جلد نمبر 4، شمارہ نمبر 4 میں شائع ہوا ہے، استفتاء کی عبارت حذف کر کے صرف یہاں جواب نقل کیا جاتا ہے:

''جواب: درصورت مرقومہ فرض عین ہے اوپر تمام اس شہر کے لوگوں کے اور
استطاعت ضرور ہے اوس کی فرضیت کے واسطے، چنانچہ اس شہر والوں کو طاقت
مقابلہ اور لڑائی کی ہے۔ بہ سبب کثرت اجتماع افواج کے اور مہیا اور موجودہ ہونے

(۱) تحریک آزادی میں اردو کا حصہ از ڈاکٹر معین الدین عقیل، ص:۱۶۶

(۲) اردو صحافت اور جنگ آزادی 1857ء، از معصوم مرادآبادی: ۱۳۴

والے آلات حرب کے تو فرض عین ہونے میں کیا شک رہا اور اور اطراف وحوالی
کے لوگوں پر جو دور ہیں باوجود خبر کے فرض کفایہ ہے۔ہاں اگر اس شہر کے لوگ باہر
ہوجائیں تو مقابلے سے یا سستی کریں اور مقابلہ نہ کریں تو اس صورت میں ان پر
بھی فرض عین ہوجائے گا اور اس طرح اور اسی ترتیب سے سارے اہل زمین پر
شرقاً اور غرباً فرض عین ہوگا اور جو عدو اور بستیوں پر ہجوم اور قتل وغارت کا ارادہ
کریں تو اوس بستی والوں پر بھی فرض ہوجائے گا۔یہ شرط ان کی طاقت سے۔''

اس فتوے پر تقریباً 28رعلمائے کرام کے دستخط اور مہریں شائع ہوئی تھیں،ان علماء میں مولانا نور جمال،محمد عبدالکریم،فقیر سکندر علی، سید محمد نذیر حسین اور مفتی صدر الدین آزردہ کے نام سرفہرست ہیں، صادق الاخبار کی ان خبروں اور سرگرمیوں سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے 1857ء کی جنگ آزادی میں کھل کر مجاہدین کا ساتھ دیا،اورآزادی کی تحریک کو اپنے انقلابی انداز وآہنگ سے بھرپور کمک پہنچائی،صادق الاخبار کے مدیر پر مقدمہ چلاکر انھیں تین سال قید کی سزا دی گئی۔

اودھ اخبار

اس دور کے اہم اخبارات میں 'اودھ اخبار' کی خدمات بے حد ممتاز اور نمایاں ہیں، جسے اردو زبان وادب کے کے ایک عظیم محسن منشی نول کشور نے لکھنؤ سے 1859ء میں جاری کیا، یہ اخبار اپنے عہد کی ادبی، معاشرتی اور سیاسی تاریخ کی مستند اور حقیقی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے،اس میں بلا جھجک حکومت کے کاموں اور کے منصوبوں پر تنقید کی جاتی تھی، اور جانثارانِ وطن اور شہداء کی قربانیوں کی داستانیں بھی پیش کی جاتی تھیں،اس کے لکھنے والوں میں اس دور کے بڑے بڑے ادیب، شاعر اور انشاپرداز ، رتن ناتھ سرشار، شرر، سید امجد علی اشہری، مرزا حیرت دہلوی، مولانا جالب دہلوی، احمد حسن شوکت، غلام محمد خان تپش وغیرہ تھے،اس اخبار نے بالخصوص مسلمانوں کی تعلیمی ترقی پر مضامین شائع کئے، مدرسۃ العلوم علی گڑھ (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کے حق میں مراسلات شائع کئے۔

تاریخ بغاوت ہند اور شمس الاخبار

سیاسی خبروں کے لئے اخبار 'رسالۂ بغاوت ہند' بھی خاصا اہم تھا، جسے مکند لال نکالتے تھے، یہ جنگ

آزادی 1857ء کے واقعات وحالات کے لئے وقف تھا، اس میں سلسلہ وار ملک کے مختلف علاقوں اور شہروں کے جنگ آزادی کے واقعات شائع ہوتے تھے، اس موضوع کے علاوہ کوئی اور موضوع اس میں شامل نہیں ہوتا تھا، 'شمس الاخبار' جو مدراس سے 1859ء میں جاری ہوا، ملکی حالات کے علاوہ غیر ملکی خبریں چھاپتا تھا، 1878ء میں جنگ روم وروس کے زمانہ میں اس اخبار نے ہندوستانی مسلمانوں کو حکومت ترکی کی امداد کی ترغیب دلائی، ہندوستان سے بھیجی جانے والی امدادی رقم میں اس اخبار کی کوششوں کا بڑا دخل تھا، اسی خدمت کی صلہ میں سلطان عبدالحمید خاں ثانی نے اس اخبار کو ''تمغۂ مجیدیہ'' دیا تھا، اس کے بعد سے اس اخبار نے ''تمغۂ مجیدیہ'' کو اپنا علامتی نشان قرار دیا اور یہ ہمیشہ سرورق پر شائع کیا جانے لگا۔

چند دیگر اخبارات

1857ء کی جنگ آزادی کے دوران جن اخبارات ورسائل نے برطانوی استعمار کے خلاف بغاوت کی فضا تیار کی، ان میں ایک طرح سے عوامی جذبات اور کوششوں کو ایک سمت عطا کی اور پوری تحریک کی فکری قیادت کی ان میں سے چند اہم اور سب سے مشہور اخبارات کا تذکرہ کیا گیا؛ لیکن اس کے علاوہ اخبارات ورسائل کی ایک طویل فہرست ہے جنہوں نے اس پہلی جنگ آزادی میں کلیدی کردار ادا کیا، جن میں سے چند مشہور یہ ہیں: خلاصۃ الاخبار، سراج الاخبار، پیام آزادی، سراج الاخبار، کوہ نور، طلسم لکھنؤ، سحر سامری،، عمدۃ الاخبار، چشمۂ فیض اور گلشن نو بہار وغیرہ۔(۱)

1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد ہندوستانی عوام کے دلوں پر عرصہ تک انگریزوں کی بربریت کی دہشت طاری رہی، خاص طور پر مسلمان انگریزوں کے انتقام کا بری طرح شکار ہوئے تھے، کیونکہ انگریز یہ سمجھتے تھے کہ انہوں نے مسلمانوں سے ہی ہندوستان کی حکومت چھینی ہے اور مسلمان ہی انگریزوں سے بدلہ لینا چاہتے ہیں، اسی طرح اردو پر بھی ایک بلائے ناگہانی نازل ہوئی، اردو کے اخبارات 'دہلی اردو اخبار' دہلی، 'صادق الاخبار' دہلی، 'دوربین اخبار' کلکتہ، 'سلطان الاخبار' کلکتہ، 'نو بہار' کلکتہ، 'حبیب الاخبار' بدایوں اور 'عمدۃ الاخبار' بریلی نے علی الاعلان جنگ آزادی میں حصہ لیا، انہوں نے انگریزوں کے غاصبانہ قبضہ کی سخت مخالفت کی، عوام کو انگریزوں سے نفرت دلا کر انہیں بھڑکایا، عوامی بدحالی کا ذمہ دار انگریزوں کو ٹھہرا کر ان کی اقتصادی لوٹ کھسوٹ کو بے نقاب کیا، انگریزوں کے خلاف جنگ کی خبریں چھاپیں، اس طرح انگریزوں کی

(۱) تفصیل کے لئے دیکھیں: اٹھارہ سو ستاون، اخبار اور دستاویزیں، نیز ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں، مرتبہ: عتیق صدیقی

غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لئے عوام اورفوج میں حریت کا جذبہ پیدا کر دیا، انگریزوں کی شکست اور ہندوستانیوں کی فتح کے لئے اردو اخبارات نے ہرممکن طریقہ اختیار کیا۔ایک اندازہ کے مطابق 1822ء سے لیکر 1899ء تک ملک کے مختلف مقامات سے تقریباً پانچ سو اخبار ورسائل جاری ہوئے۔

جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد ان اخبارات سے حکومت نے دل کھول کر بدلہ لیا، اخبارات کے لائسنس منسوخ کردیئے گئے، پریس اور دوسرا سامان ضبط کرلیا گیا، ایڈیٹروں کو قید کرکے جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا گیا، اخباروں کو موت کے منہ میں پہنچا دیا گیا، یہاں تک کہ انہیں بند کروا دیا گیا۔

اردوصحافت، اپنے دوسرے دور میں

1857ء کے بعد ہندوستان کی تصویر ہی دوسری تھی، بیس پچیس برس تک کوئی منظم تحریک انگریزوں کے خلاف نہ اٹھ سکی، اگرچہ ہندوستانیوں کے دلوں میں ان سے نفرت کا دریا جوش مارتا تھا مگر وہ کیا کرسکتے تھے، بے دست و پا تھے، مجبور تھے، اس لئے کہ سیاسی حیثیت سے بری طرح کچل دیئے گئے تھے، آزادی کی یہ پہلی جنگ آزادی ناکامی پر ختم ہوگئی اور پھر ایک طویل عرصہ تک ملک میں جمود کی فضا چھائی رہی، بالآخر ایسا وقت آیا جب اس جمود کو توڑنے کے لئے سیاسی محاذ کے ساتھ ساتھ صحافت کے محاذ پر بھی کاری ضرب لگانے کی ضرورت محسوس کی گئی اور بڑے بڑے صحافی میدان میں آئے، جنھوں نے اپنی پرجوش تحریروں سے انگریز کے خلاف عوام کے جذبات کو ابھارنے کا بیڑہ اٹھایا، بڑے بڑے پایہ کے اردو صحافیوں نے جو بعد کو سیاسی رہنما بھی بنے، اپنے پرجوش رشحات قلم سے ملک میں ایک عظیم انقلاب لانے کی داغ بیل ڈالی اور اس مقصد کے حصول کے لئے خود کو وقف کر دیا۔

اردوئے معلّٰی

یہ بیسویں صدی کے آغاز کی بات ہے جبکہ ابھی پہلی جنگ آزادی پر نصف صدی بھی مکمل نہیں ہوئی تھی، 1903ء میں ہمیں سب سے پہلے مولانا حسرتؔ موہانی کا 'اردوئے معلّٰی' نظر آتا ہے، جو انھوں نے علی گڑھ سے نکالا —— یہ اگرچہ ادبی رسالہ تھا، لیکن اس کے سیاسی مضامین انگریزی نقطۂ نظر سے باغیانہ تھے، جس سے انگریز حکمرانوں کی نیندیں حرام ہوگئیں، اس اخبار سے ضمانتیں طلب کی گئیں، اس کا پریس ضبط کیا گیا اور اثاثہ نیلام کر دیا گیا، یہی نہیں بلکہ مولانا کو سزائے قید بھی دی گئی؛ لیکن انگریز کا یہ جبر وتشدد مولانا کے جذبۂ حریت

کو دبا نہ سکا اور کسی نہ کسی حالت میں وہ اپنے اخبار کو 1942ء تک نکالتے رہے۔حسرت موہانی نہ صرف ایک بہت بڑے شاعر تھے بلکہ بہت بڑے انقلابی بھی تھے، اپنے مضامین اور تقریروں کے ذریعہ انہوں نے قوم کو جنگ آزادی میں حصہ لینے پر آمادہ کیا، حسرت کی دلیری اور جانبازی، خلوص وایثار اور ان کی آزادی وبیباکی ایسی خصوصیات تھیں جو ایک سچے انقلابی کے لئے ضروری ہیں۔

ہمدرد

بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ظفر علی خاں جیسی شخصیات میدانِ صحافت میں نظر آئیں، جنھوں نے پوری قوم کو جھنجوڑ کر رکھ دیا، مولانا محمد علی جوہر نے 1912ء میں اپنا اخبار ہمدرد دہلی سے نکالنا شروع کیا، انگریزی کا کامریڈ اخبار وہ پہلے ہی سے نکال رہے تھے، ان اخبارات کے ذریعہ انھوں نے عوام کو انگریزی سامراج کے خلاف صف آرا ہونے کا پیغام دیا، اور خاص طور سے مسلمانوں کے جذبات کو بیدار کرنے کے لئے مذہب کا واسطہ بھی دیا اور کہا ''ایسی خدا فروش حکومت جو خلافت اسلامیہ سے برسرپیکار ہو اس سے اور اس سے ملحق اداروں اور محکموں سے کسی طرح کا تعلق جائز نہیں''، مولانا محمد علی جوہر کا ہمدرد اور مولانا ظفر علی خاں کا زمیندار اوائل بیسویں صدی کے نمائندہ اخبارات میں شمار کیا جاتا ہے۔

محمد علی جوہر کی شخصیت، ان کی بے باک صداقت، ہمت، جوش اور ان کی سامراج دشمنی ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے، انہوں نے اخبار 'ہمدرد' نکالا، اور اپنے گرد لکھنے والوں، شاعروں نیز انشاء پردازوں کا ایک حلقہ بنالیا، ہمدرد میں شائع ہونے والے عالمانہ سیاسی مضامین عوام کے دلوں پر دیرپا اثر اور نقش چھوڑ جاتے تھے، ہمدرد سامراجیت کا کھلم کھلا مخالف تھا، اسی طرح اس دور کا ایک اہم اخبار 'مسلم گزٹ' ہے، یہ علامہ شبلی کی کوششوں سے نکلا تھا، جس کے ایڈیٹر وحید الدین سلیم تھے، اس اخبار کے مضامین بھی نہایت تند وتیز ہوا کرتے تھے، شبلی کا مشہور مضمون ''مسلمانوں کی پولیٹیکل کروٹ'' اسی اخبار اور اسی دور کی یادگار ہے۔

الہلال

اسی زمانہ میں مولانا نے اپنے ہفتہ وار اخبار 'الہلال' کے ذریعہ جو ظاہری اور معنوی دونوں اعتبار سے ایک نہایت معیاری اور عمدہ اخبار تھا، میدان صحافت میں ایک انقلاب برپا کردیا، اس اخبار کا خاص مقصد ملک کے مسلمانوں کے جمود کو توڑنا اور ان کے اندر سیاسی اور مذہبی بیداری پیدا کرنا تھا، تاکہ وہ برادرانِ وطن

کے ساتھ آزادی کی جدوجہد میں بھرپور حصہ لے سکیں، مولانا نے انہیں تلقین کی کہ وہ بے خوف ہوکر برادرانِ وطن کے ساتھ مل کر کام کریں اور انگریز کے خلاف جدوجہد میں پرجوش طریقہ پر حصہ لیں، لکھتے ہیں:

''میں نے 1912ء میں اردو جرنل الہلال جاری کیا، یہ امر واقعہ ہے کہ الہلال نے مسلمانوں کو تعداد کے بجائے ایمان پر اعتماد کرنے کی تلقین کی اور بے خوف ہوکر ہندوؤں کے ساتھ مل جانے کی دعوت دی، اس سے وہ تبدیلیاں رونما ہوئیں جن کا نتیجہ آج متحدہ خلافت اور سوراج میں ہے۔''(۱)

الہلال میں خود مولانا ابوالکلام آزادؒ کے علاوہ دیگر اور مشہور علماء اور قلمکاروں کے مضامین بھی شائع ہوا کرتے تھے، ان میں ایک اہم نام علامہ سید سلیمان ندویؒ کا بھی ہے، جن کی شہرت ایک عام صحافی کے بجائے ایک مصنف اور محقق کی حیثیت سے زیادہ تھی، انہوں نے زبان، تاریخ، سیرت، ادب اور قومی مسائل پر اعلیٰ معیار کے مقالات تحریر کئے، مولانا آزاد کی خواہش پر علامہ شبلیؒ نے سید سلیمان ندویؒ کو الہلال کی ادارت میں معاونت کے لئے بھیجا تھا، اب تک وہ 'الندوۃ' میں علمی کام کررہے تھے، الہلال کے ذریعہ سیاسی میدان میں اپنے شعلہ بار مضامین کے ساتھ داخل ہوئے، مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف جوجذبہ مولانا ابوالکلام آزادؒ کے الہلال نے پیدا کیا تھا، اس میں سید صاحب کے زورِ قلم کو بھی بڑا دخل تھا، خصوصاً ان کے مضمون ''مشہد اکبر''، ''الحریۃ فی الاسلام'' قابل ذکر ہیں، ''مشہد اکبر'' کان پور کے سانحہ مچھلی بازار کے واقعہ پر لکھا گیا ہے، اس کا لہجہ اتنا شدید اور تلخ تھا کہ اس کی اشاعت پر الہلال کی ضمانت ضبط ہوگئی تھی، اس پر مولانا ابوالکلام آزادؒ نے سید سلیمان ندویؒ کو مبارک باد کا تار بھیجا تھا، اس مضمون کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''.....زمین پیاسی ہے، اس کو خون چاہئے، لیکن کس کا؟ مسلمانوں کا۔ مغرب اقصیٰ کس کے خون سے رنگین ہے؟ مسلمانوں کے۔ ایران پر کس کی لاشیں تڑپتی ہیں؟ مسلمانوں کی۔ سرزمین بلقان میں کس کا خون بہتا ہے؟ مسلمانوں کا۔ ہندوستان کی سرزمین بھی پیاسی ہے۔ خون چاہتی ہے۔ کس کا؟ مسلمانوں کا۔ آخر کار سرزمین کان پور پر خون برسا اور ہندوستان کی خاک سیراب ہوئی۔''(۲)

(۱) تحریک آزادی میں اردو کا حصہ از ناشر نقوی، ص: ۴۱

(۲) تحریک آزادی میں اردو کا حصہ از معین الدین عقیل، ص: ۴۸۵

ملک کے سیاسی حالات نے مولانا آزاد کے شعور کی اشاعت میں بڑی مدد دی، الہلال مولانا آزاد کے ابتدائی نظریات کا ترجمان تھا، اس کے مضامین کے ذریعہ انھوں نے مسلمانوں کو اپنے مذہب پر فخر وناز کرنا سکھایا، الہلال کے مضامین شوکت بیان اور جوش وخروش کے سیلاب سے امنڈے پڑتے تھے، اسلوب ایسا کہ عام وخاص ہر دو طبقہ کو اپیل کرے اور ان میں آزادی کی ایک لہر دوڑ جائے، ایک موقع پر تحریر کرتے ہیں:

> ''میں وہ صور کہاں سے لاؤں جس کی آواز چالیس کروڑ دلوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کردے ..... لیکن اے رونے کو ہمت اور مایوسی کو زندگی سمجھنے والو، یہ کیا کہ تمہارے گھر میں آگ لگ چکی ہے، ہوا تیز ہے اور شعلوں کی بھڑک سخت، مگر تم میں سے کوئی نہیں جس کے ہاتھ میں پانی ہو۔''

ابوالکلام آزاد نے اپنی تحریروں کے ذریعہ مخالفوں کو زیر کرکے مسلمانوں کی شکست خوردہ ذہنیت میں خودشناسی اور خوداعتمادی پیدا کرنے کی کوشش کی تھی، تحریک اتحاد اسلامی کے پرجوش حامی اور مبلغ تھے، ترکی کے مصائب کے دنوں میں اس کے مسئلہ پر الہلال میں پرجوش اور اشتعال انگیز مضامین لکھے، اپنے وقت کے ہر قسم کے سیاسی حالات، واقعات اور مسائل پر متعدد مضامین تحریر کئے، تحریک خلافت کے تعلق سے ''ترک اور یورپ''، ''مسئلہ خلافت''، ''مسئلہ خلافت اور جمہودیہ ترکیہ'' اہم مضامین کے چند نمونے ہیں۔

الجمعیۃ

''الجمعیۃ'' جمعیۃ علماء ہند کی ترجمانی کرتا تھا، ان میں اکثر مضامین معاشرتی، معاشی، قومی اور سیاسی موضوعات پر مبنی ہوتے تھے، آزادی سے قبل دہلی سے نکلنے والے اخباروں میں الجمعیۃ، انصاری اور تیج نظر آتے ہیں، جنھوں نے تحریک آزادی کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے میں اہم کردار ادا کیا، الجمعیۃ کے عملہ ادارت سے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (بانیٔ جماعت اسلامی)، مسٹر ہلال احمد زبیری اور مولانا محمد عثمان فارقلیط جیسے مشہور صحافی وابستہ رہے، یہ اخبار جو جمعیۃ علماء ہند کا ترجمان تھا شروع سے کانگریس کا حامی اور آزادی کے کاز کو آگے بڑھانے میں پیش پیش تھا، حصولِ آزادی سے بہت پہلے یعنی 1929 میں حکومت کی چیرہ دستیوں کی بنا پر وہ بند ہوگیا اور صرف آزادی کے بعد ہی نکل سکا۔(۱)

(۱) تحریک آزادی میں اردو کا حصہ از ناشر نقوی، ص: ۴۴

زمینداراور چند دیگر اخبارات

اس دور کے اہم اخبارات ورسائل میں مولانا ظفرعلی خاں کا 'زمیندار' اخبار تھا جولاہور سے شائع ہوتا تھا، لاہور سے اور بھی متعدد اخبار شائع ہوتے تھے، ایک طرح سے یہ شہر اردو کے قومی اخباروں کا مرکز بن گیا تھا، جوتحریک آزادی کو آگے بڑھانے کا فرض انجام دے رہے تھے، 'پرتاپ'، 'ملاپ' اور 'ویر بھارت' وغیرہ دوسرے اخبارات تھے جو اسی شہر سے شائع ہوتے تھے، ایک اور پرانے اخبار 'اخبار عام' کا ذکر بھی موزوں ہوگا، یہ ایک ہفتہ وار اخبار تھا اور بہت پہلے یعنی 1871ء میں پنڈت مکندلال اوران کے چچا پنڈت گوپی ناتھ نے لاہور سے نکالنا شروع کیا تھا اور 1932ء یا 1933ء تک نکلتا رہا، منشی محبوب عالم کے اخبار 'پیسہ' نے بھی صحافت کی دنیا میں خوب دھوم مچائی جو بیرونی حکومت کی چیرہ دستیوں کو بے نقاب کرتا تھا، اخبار 'تیج' نے جو سوامی شردھانند کی یاد میں نکالا گیا تھا قومی تحریک کو پروان چڑھانے میں اپنا فرض ادا کیا اور پر جوش مضامین لکھ کر عوام کے سیاسی شعور کو بیدار کیا، یہی فرض بجنور کے سہ روزہ اخبار 'مدینہ' نے بھی انجام دیا اور آزادی کی تحریک میں اپنا بھرپور حصہ ادا کیا۔

کلکتہ سے بھی متعدد قومی اخبارات شائع ہوتے تھے جو آزادی کی تحریک کو آگے بڑھانے میں کسی سے پیچھے نہیں رہے، ان اخبارات میں 'روزانہ ہند' کا نام خاص طور سے لیا جائے گا جسے مولانا آزاد کے صحافی رفیق عبدالرزاق ملیح آبادی نکالتے تھے، روزانہ ہند سے الگ ہوجانے کے بعد انھوں نے ہفتہ وار اخبار 'اجالا' نکالا، اور یہ بھی حریت پسندوں کا ترجمان تھا، دوسری جنگ عظیم کے زمانہ میں بمبئی سے بھی متعدد اخبار جاری ہوئے مثلاً 'ہندوستان'، 'آفتاب'، 'جمہوریت'، 'اقبال'، اور 'انقلاب' وغیرہ، ان سب نے آزادی کے کاز کو آگے بڑھایا، ان کے علاوہ مختلف مقامات سے شائع ہونے والے مختلف رسائل نے بھی قوم کو بیدار کرنے کا فرض انجام دیا، ان میں دیا نرائن نگم کا 'زمانہ'، ساغر نظامی کا 'ایشیا'، انیس الرحمٰن کا 'نئی دنیا'، جوش ملیح آبادی کا 'کلیم'، سیماب اکبرآبادی کا 'شاعر'، عزیز حسن بقائی کا 'حریت' اور دیوان سنگھ مفتوں کا 'ریاست' قابل ذکر ہیں۔(۱)

تحریک آزادی میں اردو شاعری

1857ء کے انقلاب سے کافی پہلے سے انگریز ہندوستان میں موجود تھے، اور تجارت سے آگے

(۱) تفصیل کے دیکھیں: اردو صحافت اور تحریک آزادی از ڈاکٹر سمیع احمد

بڑھ کر حکومت واقتدار کے مالک بن بیٹھے تھے، ہندوستانیوں کے ساتھ ان کے مظالم اور زیادتیوں کا سلسلہ اس سے پہلے سے جاری تھا، الگ الگ شہروں اور علاقوں میں ہندوستانی باشندوں کے ساتھ ظلم وجبر کی واقعات پیش آتے رہتے تھے، اور شہریوں کے ساتھ ٹکراؤ بھی ہوتے تھے، قتل اور قید وبند کی سزاؤں سے بھی گزرنا پڑتا تھا، اس دردوکرب کا اظہار اس دور کے شاعروں کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے، اس دور کی شاعری میں انقلابی جذبات نظر نہیں آتے بلکہ اشارات وکنایات اور شعری استعارات کے پیرایہ میں ایک قسم کا شکوہ، درداور حالات کا ماتم نظر آتا ہے، اس میں ذاتی رنج والم کا احساس، دہلی کی عظمت رفتہ اور تباہی کا المیہ وغیرہ جیسے مضامین نظر آتے ہیں، اس دور کے بڑے شعراء یعنی ولیؔ، سودا، حزیںؔ، خان آرزوؔ، مصحفیؔ اور میرؔ کے اشعار اس کے گواہ ہیں، اس سلسلہ میں میرؔ کا مشہور خاص وعام شعر ملاحظہ ہو:

دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب　　　رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے برباد کر دیا　　　ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

یا

رنگ اڑ چلا چمن میں گلوں کا تو کیا نسیم　　　ہم کو تو روزگار نے بے بال وپر کیا

مصحفی (1750ء-1824ء) جو بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں، ملک کی سیاسی اور اقتصادی زبوں حالی سے متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے:

ہندوستاں کی دولت وحشمت جو کچھ کہ تھی　　　کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

سوداؔ کہتے ہیں:

ہزار حیف کوئی باغ میں نہیں سنتا　　　چمن چمن پڑی کرتی ہیں بلبلاں فریاد

یا

تھا ملک جن کا زیر نگیں صاف مٹ گئے　　　تم اس خیال میں ہو کہ نام ونشاں رہے

اس دور کی شاعری میں حالات کی تبدیلی، ملک کے انتشار اور ملک پر انگریزوں کے بڑھتے ہوئے تسلط کا درد اور شکوہ ہے، بے ثباتی کا عالم پورے ادب پر حاوی ہے، شہر آشوب، رباعی، مرثیہ، غزل، مثنوی اور نثر میں انشائیہ، رقعات اور مکاتیب تمام کے تمام حالات کی آگاہی دیتے ہیں۔

1803ء میں مغل بادشاہت کو مرہٹوں کی دستبرد سے نجات تو مل گئی مگر انگریزوں کی حکمرانی کا طوق ان

کے گلے میں ضرور پڑ گیا، ملک بادشاہ کا حکم کمپنی سرکار کا تھا، لیکن عوام میں اس کے خلاف پھر ایک جذبہ بلند ہونا شروع ہوگیا، عظمت رفتہ کا احساس لوگوں کو بے چین کئے ہوئے تھا، یہ جذبہ صرف دہلی دربار میں ہی محدود نہیں تھا بلکہ پورے ہندوستان میں پھیل رہا تھا، اس صورتِ حال میں اردو شاعری نے بہترین شعراء پیدا کئے جن کا جواب اور مدمقابل پورے اردو ادب میں نہیں مل سکا، ان میں ذوقؔ، مومنؔ، غالبؔ اور خود بہادر شاہ ظفرؔ شعراء کی فہرست میں امتیازی مقام رکھتے ہیں، پوری بادشاہت کا نقشہ ظفرؔ کے ان اشعار سے نظر میں پھر جاتا ہے:

باغِ عالم میں مناسب ہے بشر کو احتیاط ۔۔۔ اے ظفرؔ چلتی ہوا یاں دمبدم ہے مختلف

یا

جوں بوئے گل رفیقِ نسیمِ چمن ہیں ہم ۔۔۔ اے ہمدمو وطن میں غریب الوطن ہیں ہم

اور بہادر شاہ ظفر کے ان شہرۂ آفاق اور زبان زد خاص وعام اشعار سے کون نا آشنا ہوگا:

لگتا نہیں ہے دل مرا اجڑے دیار میں ۔۔۔ کس کی بنی ہے عالم ناپائیدار میں
ان حسرتوں سے کہہ دو کہیں اور جا بسیں ۔۔۔ اتنی جگہ کہاں ہے دل داغدار میں
بلبل کو باغباں سے نہ صیاد سے گلہ ۔۔۔ قسمت میں قید لکھی تھی فصل بہار میں
کتنا ہے بدنصیب ظفرؔ دفن کے لیے ۔۔۔ دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

اگر اس دور کے تفصیلی حالات کا نقشہ دیکھنا ہو تو غالب کے خطوط کا مطالعہ کرنا چاہئے، اپنی شاعری میں بھی انہوں نے کہیں رمز واستعارہ میں اور کہیں کھل کر برملا حالات کی تصویر کشی کی ہے، کہتے ہیں:

یہ گلزار اب ہوگیا خار زار ۔۔۔ خزاں ہوگئی ہائے اس کی بہار

یا

گدائی کا کاسہ لئے دربدر ۔۔۔ ہیں آوارہ اربابِ فضل وہنر

اور

بس کہ فعال ما یرید ہے آج ۔۔۔ ہر سلح شور انگلستاں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے ۔۔۔ گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرّہ ذرّۂ خاک ۔۔۔ تشنۂ خون ہے مسلماں کا

اور

ایک اہل درد نے سنسان جو دیکھا قفس　　یوں کہا آتی نہیں اب کیوں صدائے عندلیب
بال و پر دو چار دکھلاکر کہا صیاد نے　　یہ نشانی رہ گئی ہے اب بجائے عندلیب

اس زمانے عوام کے جذبات کو بیدار کرنے میں امام بخش صہبائی، مولانا فضل حق خیرآبادی، مفتی صدرالدین آزردہ، نواب شیفتہ، منیر شکوہ آبادی وغیرہ کی کاوشوں نے خاص حصہ لیا، انیسویں صدی کے اختتام پر کئی سوسائٹیاں، انجمنیں اور اصلاحی تنظیمیں قائم ہوئیں اور اسی زمانہ میں سرسید کی اصلاحی و تعلیمی تحریک نے گویا اردو ادب میں ایک نئے باب کی بنیاد ڈالی، جن کی سعی سے اردو میں افادی ادب تخلیق ہوا، 1857ء کے بعد جس شاعر کا دل سب پہلے ہندوستانیوں کی غلامی پر تڑپا وہ حالی تھے، حالی کی شاعری میں حالات کی تصویر کشی کے ساتھ عظمت رفتہ کے تذکرے اور قوم مسلم کی اصلاح وترقی کی آرزو بہت نمایاں ہے، یہ اصلاحی پہلو گویا ان کی شاعری کی خصوصیت بن گئی، مشہور زمانہ مسدس حالی اس کی سب سے عمدہ مثال ہے، جب انہوں نے مغربی تہذیب کے پاؤں تلے مشرقی تہذیب کو پامال ہوتے دیکھا تو فریاد کی

کہتے ہیں مغرب سے جب ہوگا برآمد آفتاب　　عرصۂ آفاق میں ہوگی قیامت جلوہ گر
دوستو شاید وہ نازک وقت آپہنچا قریب　　آرہی ہے روشنی مغرب سے اٹھتی اک نظر
رَو ترقی کی چلی آتی ہے موجیں مارتی　　اگلے وقتوں کے نشاں کرتی ہوئی زیر وزبر
دستکاری کو مٹاتی ، صنعتوں کو روندتی　　علم و حکمت کی پرانی بستیاں کرتی کھنڈر
ہوشیاروں کو کرشمے اپنے دکھلاتی ہوئی　　غافلوں کو موت کا پیغام پہنچاتی ہوئی

اس دور کے نمائندہ شعراء میں حالی، شبلی، محمد حسین آزاد، علامہ محمد اقبال، اکبرالہ آبادی، حسرت موہانی، آنند نرائن ملا، ساغر نظامی، اسماعیل میرٹھی، صفی لکھنوی، عبدالحلیم شرر، برج نارائن چکبستؔ، آرزو لکھنوی، سرور جہان آبادی، مولوی عبدالحق، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خاں، شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی، شورش کاشمیری، سالک لکھنوی، اختر شیرانی، سیماب اکبرآبادی، شہید رام پرشاد بسمل، شہید اشفاق اللہ خان وغیرہ کا نام قابل ذکر ہے، جنہوں نے اپنی شاعری اور جدوجہد سے آزادی کی تحریک کو تقویت بخشی، اور اس دور کی منتشر، زخم خوردہ اور حالات کی ماری ہوئی ہندوستانی قوم کو زندگی کا حوصلہ اور مستقبل کی امید عطا کی، اور بطور خاص امت مسلمہ ہندیہ کی نشاۃ ثانیہ کے لئے کوشش کی، ان میں علامہ اقبال کی شاعری زندۂ جاوید ہے جنہوں نے نہ

صرف قوم کوآزادی کا پیغام دیا بلکہ وطن کی عظمتوں کے گیت سنا کر دلوں میں حب الوطنی کا بیج بویا اور اپنے لافانی اشعار سے انسانوں کو دعوت فکر وعمل دیا، اس کے علاوہ بھی شعراء کی ایک کافی طویل فہرست ہے، ان میں سے چند شعراء کے منتخب اشعار نقل کئے جاتے ہیں:

زندہ باد اے انقلاب، اے شعلہ فانوس ہند　　گرمیاں جس کی فروغ مشعل جاں ہوگئیں
زندگی ان کی ہے دن ان کا ہے، دنیا ان کی ہے　　جن کی جانیں قوم کی عزت پہ قرباں ہوگئیں

مولانا ظفر علی خاں

اقبال آزادی کی اہمیت پرندے کی زبانی یوں یاددلاتے ہیں:

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ　　وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا
آزادیاں کہاں ہیں وہ اب اپنے گھونسلے کی　　اپنی خوشی سے آنا اپنی خوشی سے جانا
لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم　　شبنم کے آنسوؤں پر کلیوں کا مسکرانا

ہندوستانیوں کوقومی یکجہتی کا سبق کچھ یوں دیا:

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا　　ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اہل ہند کودعوت فکر وعمل دیتے ہوئے کہتے ہیں:

وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنے والی ہے　　تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے، ہونے والا ہے　　دھرا کیا ہے بھلا عہدِ کُہن کی داستانوں میں
نہ سمجھو گے تو مِٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!　　تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

شورش کاشمیری نے گرج کر کہا:

کہتا ہوں سنو! جوش جوانی کو پکارو
لینا ہے مجھے ہند کی تذلیل کا بدلہ
ناموس کی بجھتی ہوئی قندیل کا بدلہ
مشرق کے جوانوں کو سنبھلتے ہوئے دیکھوں
یہ ہند کی سرکار بدلتے ہوئے دیکھوں

شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی کے ولولہ انگیز اشعار ملاحظہ فرمائیں:

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں

بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے دم توڑ رہی ہیں تدبیریں

سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اٹھا، جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

شہید رام پرساد بسمل کا یہ شعر بچہ بچہ کی زبان پر تھا:

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے — دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

عوام کا جذبۂ حریت رنگ لایا، سرنگوں مخلوق سر بلند ہوئی، مجاہدین جنگ آزادی کی قربانیاں ٹھکانے لگیں، جانبازوں اور جاں نثاروں کے لہو سے دھرتی سیراب ہوگئی، ہندوستان کے جیالوں نے اپنی برسوں کی زنگ خوردہ غلامی کی زنجیریں کاٹ پھینکیں، اور 15/اگست 1947ء کو ہندوستان آزاد ہوگیا، ہمارا وطن آزاد ہوگیا، غلامی کا طوق، آہنی بیڑیاں، جیل کی سلاخیں...... شہیدوں، جانبازوں سپاہیوں اور وطن پر مرنے والوں کے آتش لہو سے موم ہو چکی تھیں۔

○○○

بھارت کے آئین کی تمہید

برہمنوادی سامراجیت کے خلاف انقلاب کا عہدنامہ

مولانا احمد نور عینی ❖

26 جنوری کا دن ہمارے دیش میں یوم جمہوریہ کے طور پر منایا جاتا ہے، 26 جنوری 1950 کو بھارت کے آئین کا نفاذ عمل میں آیا، جس میں بھارت کے عوامی جمہوریہ ہونے کی بات کہی گئی۔ آئین کا مسودہ دستور ساز اسمبلی کی ڈرافٹنگ کمیٹی کی طرف سے مرتب کیا گیا، ڈاکٹر بی آر امبیڈکر اس کمیٹی کے صدر تھے اور کمیٹی کے ایک معزز رکن کرشنا مچاری کے بقول مسودہ دراصل امبیڈکر نے ہی تیار کیا۔ [1] آئین کے آغاز میں ایک

❖ استاذ المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

(۱) کرشنا مچاری نے 5 نومبر 1948 کو دستور ساز اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے واضح لفظوں میں کہا تھا:

Mr. President, Sir, I am one of those in the House who have listened to Dr. Ambedkar very carefully. I am aware of the amount of work and enthusiasm that he has brought to bear on the work of drafting this Constitution….The House is perhaps aware that of the seven members nominated by you, one had resigned from the House and was replaced. One died and was not replaced. One was away in America and his place was not filled up and another person was engaged in State affairs, and there was a void to that extent. One or two people were far away from Delhi and perhaps reasons of health did not permit them to attend. So, it happened ultimately that the burden of drafting this constitution fell on Dr. Ambedkar and I have no doubt that we are grateful to him for having achieved this task in a manner which is undoubtedly commendable. (Constitution Assembly of India debate: v: XII. 5 Nov: 1948)

جناب صدر! ایوان کے ارکان کے ساتھ میں نے بھی ڈاکٹر امبیڈکر کا خطاب بہ غور سماعت کیا۔ آئین کی مسودہ سازی کے لیے ڈاکٹر امبیڈکر نے جس لگن اور محنت سے کام کیا ہے میں اس سے واقف ہوں۔۔۔۔ ایوان کو یہ بات معلوم ہوگی کہ آپ لوگوں کی طرف سے نامزد سات ارکان میں سے ایک نے استعفادے دیا، جس کی جگہ پر دوسرے کو لایا گیا، ایک کا دیہانت ہوگیا اور اس کی جگہ پر کسی کو نامزد نہیں کیا گیا، ایک امریکہ چلا گیا اور اس کی جگہ کسی اور کو نہیں لایا گیا، ایک اور رکن مملکتی امور میں مشغول ہوگیا، جس کی وجہ سے اس کی جگہ خالی رہی، ایک یا دو ارکان دلی سے دور رہتے تھے، اور غالبا علالت طبع ان کی عدم حاضری کا باعث بنی۔ بالآخر ایسا ہوا کہ اس آئین کو تیار کرنے کا بوجھ ڈاکٹر امبیڈکر پر پڑا اور مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم ان کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اس کام کو اس انداز میں انجام دیا جو بلاشبہ قابل ستائش ہے۔

تمہید(Preamble) ہے،جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے نہرو نے ترتیب دیا ہے، جب کہ آکاش سنگھ راٹھور نے اپنی کتاب''Ambedkar's Preamble'' میں یہ ثابت کیا ہے کہ یہ تمہید بھی امبیڈکر کی لکھی ہوئی ہے،نہرو نے قرارداد مقاصد(Objectives Resolution) ترتیب دی تھی، وہ امبیڈکر کے Preamble سے الگ ہے۔ بھارت کے آئین میں جو تمہید چھپی ہوئی ہے اس کے الفاظ یوں ہیں:

WE, THE PEOPLE OF INDIA, having solemnly resolved to constitute India into a **SOVEREIGN, SOCIALIST, SECULAR, DEMOCRATIC, REPUBLIC** and to secure to all its citizens:

JUSTICE, social, economic and political;

LIBERTY of thought, expression, belief, faith and worship;

EQUALITY of status and of opportunity;

and to promote among them all

FRATERNITY assuring the dignity of the individual and the unity and integrity of the Nation;

IN OUR CONSTITUENT ASSEMBLY this twenty-sixth day of November, 1949, **DO HEREBY ADOPT, ENACT AND GIVE TO OURSELVES THIS CONSTITUTION.**

(ہم، بھارت کے عوام متانت وسنجیدگی سے عزم کرتے ہیں کہ **بھارت کو ایک مقتدر سماج وادی سیکولر عوامی جمہوریہ** بنائیں اور اس کے تمام شہریوں کے لیے حاصل کریں:

انصاف،سماجی،معاشی اور سیاسی؛

آزادی خیال،اظہار،عقیدہ،دین اور عبادت؛

مساوات بہ اعتبار حیثیت اور موقع،

اوران سب میں

اخوت کو ترقی دیں،جس سے فرد کی عظمت اور قوم کے اتحاد اور سالمیت کا تیقن ہو؛

اپنی آئین ساز اسمبلی میں آج 26رنومبر 1949ء کو یہ ذریعہ ہذا اختیار کرتے ہیں،وضع کرتے ہیں اوراپنے آپ پر نافذ کرتے ہیں)

یہ دستور کی وہ تمہید ہے جسے انگریزی میں پریمبل Preamble کہا جاتا ہے، اس میں تین الفاظ: Socialist(سماجوادی)، Secular اور Integrity(سالمیت) کا اضافہ 1976 میں پارلیمنٹ سے قانون پاس کر کے کیا گیا، ان تینوں الفاظ کی اپنی اہمیت ہے، مگر چوں کہ تمہید کے اضافہ شدہ یہ تین الفاظ امبیڈکر کے نہیں ہیں اور ہم یہاں تمہید کے کلیدی الفاظ کو امبیڈکر کی فکر اور ان کی تحریر وتقریر کی روشنی میں سمجھنا چاہتے ہیں، اس لیے ہم اس مضمون میں اضافہ شدہ ان تین الفاظ سے بحث نہیں کریں گے۔ اس مقالہ میں دستور کے درج ذیل کلیدی الفاظ زیر بحث ہوں گے:

- آزادی (Liberty)
- مساوات (Equality)
- اخوت (Fraternity)
- انصاف (Justice)
- عوامی جمہوریہ (Democratic Republic)
- عظمت (Dignity)
- قوم (Nation)

ان الفاظ پر بحث کرنے سے پہلے برہمنوادی پس منظر اور اس کی سامراجیت کی مختصر پیش کر دینا مناسب ہوگا۔ آئین اور اس کی تمہید کو عام طور سے اس نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے کہ استعمار سے آزادی کے بعد حکومتی نظم ونسق کے لیے لکھا گیا ایک ''ہدایت نامہ'' ہے، یہ ایک ناقص نقطۂ نظر ہے، دستور کی تمہید کا مطالعہ اگر بی آر امبیڈکر فکر اور ان کی تحریروں اور تقریروں کی روشنی میں کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک اور غلامی کے خلاف انقلاب کا ''عہد نامہ'' ہے۔ دستور ترتیب دینے کے وقت ملک برطانوی استعمار سے آزاد ہو چکا تھا؛ مگر برہمن وادی غلامی سے آزاد نہیں ہوا تھا، اور افسوس کہ ابھی تک آزاد نہ ہو سکا، امبیڈکر کی پوری زندگی برہمنوادی غلامی سے آزادی کے لیے جدوجہد سے عبارت ہے، ان کا ترتیب دیا ہوا آئین دراصل برہمنوادی غلامی کے خلاف انقلاب کی دستاویز ہے اور اس کی تمہید اس انقلابی تحریک کا عہد نامہ ہے۔

برہمنوادی استعمار کی تاریخ کئی ہزار سال پرانی ہے، مائیکل بام شاد کی طرف سے 2001 میں پیش کی گئی ڈی این اے رپورٹ کے مطابق لگ بھگ چار ہزار سال قبل یوریشیا سے آریہ نامی ایک قوم آئی، اس

نے بھارت پر حملہ کیا، ہڑپہ موہن جوداڑو جیسی تہذیب کو تہس نہس کیا، بھارتی قوموں (مولنواسیوں) کو مغلوب کر کے انھیں اپنا غلام بنایا، انھیں درجہ وار طبقات میں اونچ نیچ کی بنیاد پر عمودی طور پر تقسیم کیا، جو سماج میں رہ کر ان کی خدمت کے لیے آمادہ ہوئے وہ شودر کہلائے اور جو سماج سے باہر نکلنے پر مجبور ہوئے وہ اتی شودر کہلائے، سماج سے باہر گاؤں کے ختم پر رہنے والوں کو امبیڈکر کے بقول گائے کھانے کی وجہ سے اچھوت بنایا گیا، اس طرح انسانوں کو ذات پات اور چھوت چھات کی بنیاد پر غلامی کی زنجیروں میں جکڑ لیا گیا، یہ سارے کرشمے آریائی برہمن کے دماغ نے دکھائے، شاستروں میں برہمن کو آدمی سے افضل بتایا گیا، منوسمرتی میں کہا گیا:

भूतानां प्राणिनः श्रेष्ठाः प्राणिनां बुद्धिजीविनः ।

बुद्धिमत्सु नराः श्रेष्ठा नरेषु ब्राह्मणाः स्मृताः ॥ (۱)

''ساکن ومتحرک جانداروں میں کیڑا افضل ہے، اور اس سے چار پایہ اور اس سے آدمی اور اس سے برہمن افضل ہے''۔ *

برہمن بھودیوتا قرار پایا، اس کے فضائل ومناقب میں یہ نقل کیا گیا:

''دِیْوَادِھنَمْ جَگَتْ سَرْوَمْ، مَنْتْرَادِھنَمْ تَ دِیْوْتَا، تَ دِیْوْتَا بْرَہْمَنَادِھنَمْ، تَسْمَاتَ بْرَہْمَنَا مَمَ دِیْوْتَا''۔(۲)

یعنی پوری کائنات دیوتا کے قبضہ میں ہے، اور دیوتا منتر کے قبضہ میں ہے، اور منتر برہمن کے قبضہ میں ہے، لہذا برہمن ہمارا دیوتا ہے۔ ایک طرف استعماری طبقہ کو اتنا اونچا اٹھایا گیا کہ اسے دیوتا بنا دیا گیا، دوسری طرف مولنواسی طبقہ (شودر واتی شودر) کو اتنا نیچے دبایا گیا کہ انھیں ہر طرح کے حق سے محروم کر دیا گیا، ان کا کام صدق دل سے دو یجہ (برہمن، چھتری، ویش) کی خدمت کرنا قرار پایا۔ شاستروں میں کہا گیا:

भूतानां प्राणिनः श्रेष्ठाः प्राणिनां बुद्धिजीविनः ।

बुद्धिमत्सु नराः श्रेष्ठा नरेषु ब्राह्मणाः स्मृताः ॥ (۳)

''شودر کے لیے ایک ہی کرم پر بھو نے ٹھیرایا، یعنی صدق دل سے ان تینوں کی خدمت کرنا''۔

---

(۱) ادھیائے:1، اشلوک: 96   * منوسمرتی کے ترجمہ میں پنڈت کرپا رام شرما جگرانوی کے اردو ترجمہ سے مدد لی گئی ہے۔

(۲) ہندو مینرس، کسٹمس اینڈ سرمنیز:139۔ اے جے اے ڈبواز، آکسفورڈ

(۳) ادھیائے:1، اشلوک:96

वाणिज्यं कारयेद्वैश्यं कुसीदं कृषिं एव च ।

पशूनां रक्षणं चैव दास्यं शूद्रं द्विजन्मनाम् ॥ (۱)

''ویش کا کام کھیتی کرنا، سود لینا، جانور پالنا ہے، یہ سب کام راجہ ویش سے کروائے، اور شودر کو حکم دے کہ وہ دویجہ کی خدمت کرے''۔

एकजातिर्द्विजातींस्तु वाचा दारुणया क्षिपन् ।

जिह्वायाः प्राप्नुयाच्छेदं जघन्यप्रभवो हि सः ॥ (۲)

''اگر شودر کسی دویجہ کے ساتھ بدکلامی کرے تو اس کی زبان کاٹ دی جائے؛ کیوں کہ وہ جن کی خدمت کرنے کے لیے مقرر ہوا ہے بجائے ان کی خدمت کرنے کے ان کی توہین کرتا ہے''۔

گوتمادھرم سوتر میں کہا گیا:

اگر وہ (شودر) وید کی تلاوت سن لے تو اس کے کانوں میں ٹن یا لاکھ پگھلا کر ڈال دیا جائے۔ اگر وہ خود تلاوت کرے تو اس کی زبان کاٹ ڈالی جائے۔ اگر وہ اسے یاد کرے تو اس کے جسم کے ٹکڑے کر دیے جائیں۔ اگر وہ نشست و برخاست اور رفتار و گفتار میں دویجہ کی برابری کرنا چاہے تو اسے پیٹا جائے''۔(۳)

ان تعلیمات پر مبنی ذات پات کے نظام نے شودر واتی شودر کہے جانے والے بھارتیوں کی حالت بد سے بدتر کر دی، زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں ہے، اٹھارویں صدی کی بات ہے کہ مرہٹہ سلطنت کے برہمن پیشوا راجاؤں کی طرف سے پست طبقات کے لیے یہ قانون بنایا گیا کہ یہ لوگ جب گھر سے باہر نکلیں تو اپنے سینے پر ایک مٹکا باندھ کر نکلیں تا کہ تھوکنا ہو تو اس مٹکے میں تھوکیں، اور اپنے پیچھے جھاڑو باندھ کر چلیں، اور اپنے نقش قدم جھاڑتے چلیں، تا کہ ان کے تھوک اور ان کے نقش قدم سے زمین ناپاک ہونے سے محفوظ رہے۔ ٹراونکور میں پست طبقات کی عورتوں کو سینہ چھپانے کی اجازت نہیں تھی، بصورت دیگر سینہ ٹیکس ادا کرنا پڑتا۔ بھارتی سماج کی حالت زار ایک بیرونی سیاح سے بھی سنتے چلیں، لوڈوویکوڈی ورتھما Ludovico Di Varthema نامی ایک

---

(۱) ایضا: ادھیائے: 8، اشلوک: 410

(۲) ایضا، ادھیائے: 8، اشلوک: 270

(۳) گوتمادھرم سوتر: ادھیائے: 12، اشلوک: 1 تا 7

اطالوی سیاح1502ء میں بھارت آیا، اس نے کالی کٹ کے برہمنوں کے بارے میں اپنا تبصرہ ان الفاظ میں درج کیا ہے:

> It is a proper, and the same time pleasant thing to know who these Brahmins are. You must know that they are the chief persons of the faith, as priests are among us. And when the King takes a wife, he selects the most worthy and the most honoured of these Brahamins and makes him sleep the first night with his wife, in order that he may deflower her.(۱)

> یہ ایک بہتر اور موزوں وقت ہے کہ آپ برہمنوں کے بارے میں جان لیں کہ یہ کون لوگ ہیں، آپ یوں سمجھیں کہ جس طرح ہمارے یہاں پادری ہوتے ہیں ویسے ہی یہ لوگ مذہبی پیشوا ہیں۔ راجہ جب شادی کرتا ہے تو ان برہمنوں میں سب سے زیادہ قابل اور محترم برہمن کا انتخاب کرتا ہے اور پہلی رات گذارنے کے لیے اپنی بیوی اس کے حوالے کر دیتا ہے، تا کہ وہ اسے ثیبہ کرے۔

یہ چند مثالیں بھارتی سماج کی حالت زار کو سمجھنے کے لیے پیش کی گئیں، انسانی تاریخ کے اس بدترین نظام کے خلاف کئی تحریکیں اور شخصیتیں اٹھیں جن میں گوتم بدھ کی شخصیت نمایاں اہمیت کی حامل ہے۔ عہد وسطی میں جب اسلام آیا تو پست و پسماندہ طبقات کی بڑی تعداد برہمنواد سے آزادی حاصل کرنے کے لیے اسلام کے دامن رحمت میں آئی۔ عہد جدید میں اس غیر انسانی نظام کے خلاف راشٹر پتا جوتی با پھلے(1827-1890) نے علم بغاوت بلند کیا، اور ''غلام گیری'' کتاب لکھ کر شودر واتی شودر قرار دیے گئے مولنواسیوں کو برہمنوادی غلامی سے نجات دلانے کے لیے تحریک چھیڑی، یہ وہ دور ہے جب ملک میں برطانوی استعمار سے آزادی کی تحریک چل رہی تھی، پھلے نے برہمنوادی استعمار سے آزادی کی تحریک چھیڑی، امبیڈکر نے پھلے کو اپنا گرو تسلیم کیا اور برہمنوادی غلامی سے آزادی کے لیے پھلے کی شروع کی گئی تحریک کو مضبوط کرنے میں اپنی ہر طرح کی صلاحیتیں لگا دیں۔

تحریک آزادی میں جب سوراج (اپنی حکومت) کے لیے آواز اٹھی اور پورا ملک سوراج کے نعروں سے گونج اٹھا تو اس وقت بھی امبیڈکر کو سوراج سے زیادہ منووادی غلامی سے آزادی کی فکر تھی، یہاں اس بات کا

The Travels of Ludovico Di Varthema: Pub. Cambridge university. P 141 (۱)

ذکر بیجا نہ ہوگا کہ سوراج کا نعرہ تلک نے دیا تھا اور تلک نے ہی پست وپسماندہ ذاتوں کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا تھا کہ کیا انھیں ایوان میں آکر ہل چلانا ہے؟ یعنی مطلب صاف ہے کہ تلک نے جس سوراج کا نعرہ لگایا وہ سوراج دراصل ''برہمن راج'' یا ''دویجہ راج'' ہے نہ کہ تمام بھارتیوں کا راج، یعنی تلک کا سوراج پست وپسماندہ ذاتوں کی غلامی کا راج ہے۔ امبیڈکر یہ سب اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، اس لیے انھیں سوراج کے پیچھے منوواد چھپا نظر آتا تھا، امبیڈکر کا کہنا تھا کہ منوواد اور برہمن واد سے آزادی حاصل کیے بغیر برطانوی غلامی سے آزادی حاصل کرنا غلامی کی طرف ایک قدم اور بڑھانے کے مترادف ہے، وہ اپنی مشہور کتاب ''Annihilation of Caste'' میں لکھتے ہیں:

> In the fight for Swaraj you fight with the whole nation on your side. In this, you have to fight against the whole nation and that too, your own. But it is more important than Swaraj. There is no use having Swaraj, if you cannot defend it…., Swaraj for Hindus may turn out to be only a step towards slavery.(۱)
>
> سوراج کی لڑائی میں تو پوری قوم لڑنے والوں کے ساتھ کھڑی ہے، مگر ذات پات کی جنگ میں آپ کو پوری قوم سے اور وہ بھی اپنی ہی قوم سے لڑائی لڑنی ہوگی؛ اسی وجہ سے یہ جنگ سوراج کی جنگ سے زیادہ اہم ہے۔ اگر آپ ذات پات کی غلامی کو ختم نہیں کر پائے تو سوراج حاصل کرنا بے فائدہ ہے...... ہندووں (سورنوں) کا سوراج (پست وپسماندہ ذاتوں کی) غلامی کی طرف ایک قدم اور آگے بڑھادے گا''۔

سوراج کے لفظ نے برطانوی استعمار سے آزادی کی تحریک میں ایک عجیب جوش اور ولولہ پیدا کیا؛ مگر امبیڈکر گوکہ برطانوی استعمار سے آزادی کے حامی تھے؛ مگر وہ دراصل برہمنواد سے آزادی کی تحریک کے سپاہی تھے، سوراج کے لفظ نے ان کے اندر ولولہ پیدا کرنے کے بجائے انھیں دیش کے مستقبل کے تئیں فکرمند کردیا، امبیڈکر لکھتے ہیں:

> The idea of Swaraj recalls to the mind of many of us the

---

(۱) Annihilation of Caste. BAWS: V: 1, P: 80

tyrannies, oppressions and injustice practiced upon us in the past and fear of their recurrence under Swaraj.(۱)

سوراج کا خیال ماضی میں ہم پر روا رکھے گئے ظلم وناانصافی کے نظام کو ہم میں بہتوں کے ذہن میں تازہ کر دیتا ہے، اور مجھے ڈر ہوتا ہے کہ سوراج ملنے کے بعد وہی سب کچھ ہوگا۔

امبیڈکر سوراج کو ہندوراج (اونچی ذات والوں کا راج) مانتے تھے، وہ لکھتے ہیں:

Swaraj would be the substitute of domination by the British for domination by the Hindus.... Swaraj meant Hindu Raj. (۲)

''سوراج برطانوی غلبہ کے بجائے ہندوؤں (اونچی ذات والوں) کے غلبہ کا نام ہے، ...... سوراج کا مطلب ہے ہندوراج''۔

ایک جگہ تو امبیڈکر نے ساورکر کے حوالے سے لکھا ہے کہ سوراج کا مطلب ''ہندوتو'' کے سوا کچھ نہیں:

Swaraj to the Hindus must mean only that in which their Swaraj their Hindutva. (۳)

ہندوؤں (اونچی ذات والوں) کے لیے سوراج کا مطلب صرف ہندوتو ہے۔

امبیڈکر سوراج (برطانیہ سے آزادی) کے خلاف نہیں تھے؛ بل کہ اس سوراج کے حامی تھے بشرطیکہ برطانوی استعمار کے ساتھ ساتھ برہمنوادی غلامی کا بھی خاتمہ ہو۔ ان کا ماننا تھا کہ منوواد اور ورن ووستھا سے آزادی کے بغیر ملنے والے سوراج میں غلام طبقہ مظلوم ہی رہے گا، وہ لکھتے ہیں:

If it is left to governing classes to make what it likes of Swaraj the principal item in it will be the suppression of the servile classes. (۴)

---

(۱) BABA SAHEB AMBEDKAR WRITINGS & SPEECHES, V: 2, PP: 506

نوٹ: آگے مذکورہ حوالہ BAWS سے دیا جائے گا۔

(۲) BAWS, V: 17, part: 3, P: 366

(۳) BAWS: V: 8, P: 135

(۴) What Congress and Gandhi have done to the Untouchables, BAWS: V: 9, P:209

اگر حاکم طبقہ کو اپنی مرضی کے مطابق سوراج کے اصول بنانے دے دیے جائیں تو اس میں غلام طبقہ مظلوم رہے گا۔

In short, Swaraj will not be government by the people but it will be a government run by the governing class and in the absence of Government by the people, government for the people will be what the governing class will choose to make of it. (۱)

مختصراً یہ کہ سوراج عوام کا راج نہیں ہوگا، بل کہ حاکم طبقہ کا راج ہوگا، عوم کا راج نہ ہونے کی صورت میں عوام پر کیا جانے والا راج حاکم طبقہ کی خواہشات کے مطابق ہوگا۔

یہاں یہ بات محتاج وضاحت نہیں ہے کہ اس عبارت میں حاکم طبقہ سے دویجہ (برہمن، چھتری، ویش) بالخصوص برہمن اور غلام طبقہ سے شودر روایتی شودر (ایس سی، ایس ٹی، بی سی/ او بی سی) مراد ہیں۔

امبیڈکر کے ان اقتباسات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ برطانوی استعمار سے آزادی کی تحریک کے دوران وہ ملک کو منووادی غلامی سے آزاد کرانے کے لیے کس قدر فکر مند تھے، وہ صرف برطانوی غلامی سے آزادی حاصل کرنے پر مطمئن نہیں تھے؛ بل کہ انھیں یہ ڈر تھا کہ کہیں برطانوی استعمار کے جانے کے بعد دیش منوواد کی زنجیروں میں مزید جکڑ نہ جائے۔ لہٰذا جب انھوں نے دستور کی تمہید لکھی تو اس میں ذات پات اور منوواد کے خلاف برپا کیے گئے جوتی باپھلے کے انقلاب کو کامیاب بنانے کی پوری کوشش کی، تمہید میں Sovereign[۲] (مقتدر) کا لفظ برطانوی استعمار سے آزادی کی طرف اشارہ کرتا ہے، باقی کلیدی الفاظ منوواد کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کی کوششوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں، یعنی یہ تمہید جہاں اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ یہ ملک اب انگریزوں کا غلام نہیں رہا وہیں اس سے کہیں زیادہ اس بات کی

---

(۱) Ibid: 212

(۲) Sovereign سے وہ مملکت مراد ہوتی ہے جو امور داخلہ وخارجہ دونوں میں مکمل طور پر خودمختار وآزاد ہو، داخلہ یا خارجہ پالیسی میں کسی اور مملکت کے تابع نہ ہو۔ Sovereign کے مقابل میں ایک لفظ Suzerain کا استعمال ہوتا ہے، اس سے وہ مملکت مراد ہوتی ہے جو امور داخلہ میں تو آزاد اور خودمختار ہو مگر امور خارجہ میں کسی اور مملکت کے تابع ہو۔

طرف توجہ دلاتی ہے کہ دیش میں سماجی انقلاب کو مکمل طور پر برپا کیا جائے اور ذات پات ومنوواد سے پاک مساوات پر مبنی مثالی سماج کی تشکیل کی جائے۔

ذیل میں تمہید کے کلیدی الفاظ کو لے کر ہم اس بات کو سمجھانے کی کوشش کریں گے کہ یہ تمہید سماجی انقلاب کے قیام اور برہمنیت کے خلاف بغاوت کا عہد نامہ کیسے ہے۔

☆ **آزادی، مساوات، اخوت(Liberty, Equality, Fraternity):**

تمہید میں Liberty(آزادی)Equality(مساوات)، Fraternity(اخوت) کا ذکر ہے۔ عام طور پر لوگوں کے ذہن میں ان الفاظ کا عام اور سادہ مفہوم رہتا ہے، جب کہ امبیڈکر کے ذہن میں اس سادہ اور عام مفہوم کے علاوہ ایک خاص مفہوم بھی تھا، یہ خاص مفہوم ذات پات کے خاتمہ سے جڑا ہوا تھا، اپنی کتاب Annihilation of Caste میں وہ لکھتے ہیں:

> My ideal would be a society based on Liberty, Equality and Fraternity. And why not? What objection can there be to Fraternity? I cannot imagine any. An ideal society should be mobile, should be full of channels for conveying a change taking place in one part to other parts. In an ideal society there should be many interests consciously communicated and shared. There should be varied and free points of contact with other modes of association. In other words there must be social endosmosis. This is fraternity, which is only another name for democracy …... Any objection to Liberty? …. Why not allow liberty to benefit by an effective and competent use of a person's powers? The supporters of caste who would allow liberty in the sense of a right to life, limb and property, would not readily consent to liberty in this sense, inasmuch as it involves liberty to choose one's profession. But to object to this kind of liberty is to perpetuate slavery. For slavery does not merely mean a legalized form of subjection. It means a state of society in which some men are forced to accept

from other the purposes which control their conduct. ….. Any objection to equality? … A man's power is dependent upon (1) physical heredity, (2) social inheritance or endowment in the form of parental care, education, accumulation of scientific knowledge, everything which enables him to be more efficient than the savage, and finally, (3) on his own efforts. In all these three respects men are undoubtedly unequal. But the question is, shall we treat them as unequal because they are unequal? This is a question which the opponents of equality must answer…... But what would happen if men were treated unequally as they are, in the first two respects? It is obvious that those individuals also in whose favour there is birth, education, family name, business connections and inherited wealth would be selected in the race. But selection under such circumstances would not be a selection of the able. It would be the selection of the privileged. The reason therefore, which forces that in the third respect we should treat men unequally demands that in the first two respects we should treat men as equally as possible. (۱)

میرے نزدیک مثالی سماج وہ ہے جو آزادی (Liberty)، مساوات (Equality) اور بھائی چارگی (Fraternity) کی بنیادوں پر تشکیل دیا گیا ہو۔ کیوں نہیں؟ بھائی چارگی میں کیا اعتراض ہوسکتا ہے؟ مجھے تو کوئی تو اعتراض سمجھ میں نہیں آتا۔ ایک مثالی سماج متحرک سماج ہونا چاہیے، اس میں آپسی روابط کے ذرائع وافر مقدار میں ہونے چاہئیں؛ تاکہ سماج کے ایک حصہ میں ہونے والی تبدیلی دوسرے حصہ تک پہنچ سکے، ایک مثالی سماج میں ایسے متعدد مفادات

Annihilation of Caste. BAWS. V: 1, P: 57-58 (۱)

ہونے چاہئیں جن پر شعوری طور پر باہم تبادلۂ خیال کیا جائے اور جنھیں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ساجھا کیا جائے۔ سماج کے مختلف طبقات کے ساتھ رابطہ استوار کرنے کے مختلف آزادانہ نقطہ ہائے ارتباط ہونے چاہئیں، بالفاظ دیگر سماجی انجذاب (Social Endosmosis) ہونا بہت ضروری ہے۔ بھائی چارگی جمہوریت کا ہی ایک دوسرا نام ہے .... آزادی پر کوئی اعتراض؟ ..... سوال یہ ہے کہ فرد کو اس بات کی آزادی کیوں نہیں کہ وہ اپنی طاقتوں اور صلاحیتوں کا موثر ومناسب استعمال کر کے ان سے فائدہ اٹھا سکے؟ ذات پات کی حمایت کرنے والے جو آزادی کو زندگی گذارنے، جسم کی حفاظت کرنے اور جائیداد رکھنے کے حق کے مفہوم میں لیتے ہیں، وہ آزادی کے اس مفہوم پر بہ آسانی راضی نہیں ہوں گے؛ کیوں کہ اس مفہوم میں فرد کو پیشہ منتخب کرنے کا حق شامل ہے؛ مگر اس قسم کی آزادی پر اعتراض کرنا دراصل غلامی کو برقرار رکھنے کی وکالت کرنا ہے؛ کیوں کہ غلامی سے مملوکیت کی قانونی شکل ہی محض مراد نہیں ہوتی؛ بل کہ اس سے مراد سماج کی وہ صورتحال ہوتی ہے جس میں کچھ لوگوں کو خواہی نخواہی دوسرے لوگوں کے مقاصد کی تکمیل کے لیے مجبور ہونا پڑتا ہے ...... مساوات پر کوئی اعتراض؟ ۔۔۔ کسی بھی انسان کی طاقت وصلاحیت تین چیزوں پر منحصر ہے: (1) جسمانی موروثیت، (2) سماجی وراثت یا وہ عطیہ جو والدین کی تربیت، تعلیم اور سائنسی علم کے حصول کی شکل میں کسی انسان کو حاصل ہوتا ہے اسی طرح ہر وہ صفت وخصوصیت جو اسے وحشی انسان کے بجائے قابل ترین اور اہل ترین انسان بناتی ہے، اور (3) انسان کی اپنی کوششیں۔ ان تینوں باتوں میں تمام انسانوں کے درمیان بلاشبہ مساوات نہیں پائی جاتی؛ مگر سوال یہ ہے کہ کیا ان تینوں میں انسانوں کے درمیان مساوات نہ ہونے کی وجہ سے ہم ان کے ساتھ سلوک بھی غیر مساویانہ کریں؟ یہ ایک سوال ہے جس کا جواب دینا مساوات کے مخالفین کی ذمہ داری ہے ..... اگر پہلی دو باتوں میں

انسانوں کے غیر مساوی ہونے کی بنیاد پر ان کے ساتھ غیر مساویانہ سلوک روا رکھا جائے تو کیا ہوگا؟ یہ واضح ہے کہ اس مقابلہ میں وہی افراد منتخب ہوں گے جو پیدائش، تعلیم، خاندانی نام، تجارتی روابط اور موروثی دولت میں اعلی سمجھے جاتے ہوں گے؛ لیکن ان حالات میں یہ انتخاب قابل شخص کا انتخاب نہیں ہوگا؛ بل کہ مراعات یافتہ فرد کا انتخاب ہوگا، لہذا جو سبب ہم سے مذکورہ بالا تین باتوں میں سے تیسری بات میں لوگوں سے غیر مساویانہ سلوک کا تقاضا کرتا ہے وہی سبب ہم سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ ہم پہلی دو باتوں میں جہاں تک ہو سکے لوگوں کے ساتھ مساویانہ سلوک کریں۔

مساوات، اخوت اور آزادی یہ تینوں سماجی انقلاب برپا کرنے اور مثالی سماج تشکیل دینے میں بہت اہمیت کے حامل ہیں، منوواد کی پوری عمارت عدم مساوات کی بنیادوں پر کھڑی ہے، مساوات کے قیام سے یہ عمارت زمین پر آ گرے گی، آزادی کی اہمیت یہ ہے کہ اگر آزادی نہ ہو تو مساوات وہ کچھ کرے گی جو کمیونزم نے سویت یونین میں کیا، اور اخوت کی اہمیت امبیڈکر کے الفاظ میں یہ ہے کہ اگر اخوت نہ ہو تو آزادی مساوات کو تباہ کرے گی اور مساوات آزادی کو تباہ کرے گی۔(۱)

ان تینوں الفاظ کو امبیڈکر نے دستور ساز اسمبلی کی اپنی آخری تقریر میں جس سیاق میں ذکر کیا ہے اس سے بھی یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ امبیڈکر نے ان کا استعمال برہمنواد سے آزادی اور سماجی انقلاب کے قیام کے لیے کیا ہے، وہ کہتے ہیں:

> Political democracy cannot last unless there lies at the base of it social democracy. What does social democracy mean? It means a way of life which recognizes liberty, equality and fraternity as the principles of life. These principles of liberty, equality and fraternity are not to be treated as separate items in a trinity. They form a union of trinity in the sense that to divorce one from the other is to defeat the very

---

BAWS: V: 4, P: 283 (۱)

purpose of democracy. Liberty cannot be divorce from equality, equality cannot be divorced from liberty, nor can liberty and equality be divorced from fraternity. Without equality liberty would produce the supremacy of the few over the many. Equality without liberty would kill individual initiative. Without fraternity liberty and equality could not become a natural course of things. (۱)

سیاسی ڈیموکریسی کا وجود سماجی ڈیموکریسی پر منحصر ہے، سماجی ڈیموکریسی کا کیا مطلب ہے؟ سماجی ڈیموکریسی کا مطلب ہے ایسا نظام حیات جس میں آزادی، مساوات اور اخوت کو اصول حیات کے طور پر تسلیم کیا گیا ہو، آزادی، مساوات اور اخوت کے ان اصولوں کو ایک دوسرے سے جدا کر کے نہیں برتا جاتا، تینوں مل کر ایک مثلث بناتے ہیں، اس معنی کر کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنے سے اصل مقصود فوت ہوجاتا ہے، آزادی کو مساوات سے الگ نہیں کیا جاسکتا ہے، اور نہ مساوات کو آزادی سے الگ کیا جاسکتا ہے، اور نہ ہی آزادی اور مساوات کو اخوت سے الگ کیا جاسکتا ہے۔ مساوات کے بغیر آزادی سے اقلیت کی اکثریت پر بالا دستی قائم ہوتی ہے، آزادی کے بغیر مساوات سے انفرادی اقدامات تباہ ہوجاتے ہیں، اخوت کے بغیر آزادی اور مساوات فطری عمل نہیں بن سکتی۔

☆ انصاف(Justice):

پریمبل یعنی دستور کی تمہید کے کلیدی الفاظ میں ایک لفظ انصاف (Justice) ہے، یہ لفظ مذکورہ بالا تینوں الفاظ: آزادی، مساوات، اخوت کا سرچشمہ بھی ہے اور ثمرہ بھی، امبیڈکر کے الفاظ میں:

In short justice is simply another name for liberty equality and fraternity. (۲)

مختصر یہ کہ انصاف دراصل مساوات، آزادی اور اخوت کا ہی دوسرا نام ہے۔

(۱) Constitution Assembly of India debate: V: X1. 25 Nov, 1949

(۲) Philosophy of Hinduism, BAWS: V: 3, P: 25

انصاف کے لفظ کے ساتھ پہلے نمبر پر سماجی انصاف کو رکھا ہے، جس سے سماجی انصاف کی اہمیت سمجھ میں آتی ہے، نیز امبیڈکر کے نزدیک سماجی انصاف کے بغیر نہ سیاسی انقلاب کامیاب ہے اور نہ معاشی انقلاب، سیاسی انقلاب کی بات سوراج کے تحت اوپر آ گئی، معاشی انقلاب کے بارے میں امبیڈکر لکھتے ہیں:

That, the social order prevalent in India is a matter which a Socialist must deal with, that unless he does so he cannot achieve his revolution and that if he does achieve it as a result of good fortune he will have to grapple with it if he wishes to realize his ideal, is a proposition which in my opinion is incontrovertible. He will be compelled to take account of caste after revolution if he does not take account of it before revolution. This is only another way of saying that, turn in any direction you like, caste is the monster that crosses your path. You cannot have political reform, you cannot have economic reform, unless you kill this monster. (۱)

میری رائے میں اس بات میں کوئی دو رائے نہیں ہوسکتی کہ بھارت میں رائج سماجی نظام ایک ایسا مسئلہ ہے جس سے نمٹے بغیر کسی اشتراکیت پسند کو کوئی چارہ نہیں ہے، جب تک وہ اس سے نمٹ نہ لے اپنے انقلاب میں کامیاب نہیں ہوسکتا، بالفرض خوش قسمتی سے کامیابی مل بھی جائے تو اگر وہ اپنے نظریہ کے انطباق کی خواہش رکھتا ہے تو پھر اسے اس مسئلہ سے نمٹنا ہی پڑے گا۔ اگر وہ انقلاب سے پہلے ذات پات کے نظام پر توجہ نہیں دے گا تو انقلاب کے بعد اسے اس پر توجہ دینے پر مجبور ہونا پڑے گا۔ بالفاظ دیگر یوں کہا جاسکتا ہے کہ آپ جس رخ پر جانا چاہیں جائیں، ذات پات آپ کی راہ میں حائل ایک سنگ گراں ہے، آپ جب تک اسے دونیم نہیں کریں گے نہ آپ سیاسی اصلاح انجام دے سکتے ہیں اور نہ ہی معاشی اصلاح۔

---

(۱) Annihilation of Caste. BAWS: V: 1, P: 47

☆ عوامی جمہوریہ (Democratic Republic):

تمہید میں Democratic Republic کے الفاظ آئے ہیں، ان الفاظ سے کسی کو یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ ان کا تعلق برہمنیت مخالف انقلاب سے نہیں ہے؛ مگر امبیڈکر کی دستور ساز اسمبلی میں کی گئی آخری تقریر پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ ان دونوں الفاظ کا رشتہ بھی امبیڈکر کے نزدیک برہمنیت مخالف انقلاب سے جڑا ہوا ہے، امبیڈکر نے اپنی تقریر میں ان دونوں الفاظ کو گوتم بدھ کے برہمنیت مخالف انقلاب سے جوڑ کر ذکر کیا ہے، جس سے یہ بات صاف ہے کہ یہ الفاظ بھی سماجی انقلاب اور برہمنیت مخالف تحریک کے نقیب ہیں، دستور ساز اسمبلی کی آخری تقریر میں امبیڈکر نے ڈیموکریسی پر قدرے تفصیل سے بات کی ہے، انھوں نے ڈیموکریسی کی دوقسمیں کی ہیں: سیاسی اور سماجی، سیاسی ڈیموکریسی کے لیے سماجی ڈیموکریسی کو ناگزیر بتایا ہے، وہ کہتے ہیں:

> The third thing we must do is not to be content with mere political democracy. We must make our political democracy a social democracy as well. Political democracy cannot last unless there lies at the base of it social democracy. What does social democracy mean? It means a way of life which recognizes liberty, equality and fraternity as the principles of life. (۱)
>
> تیسری بات یہ کہ ہمیں محض سیاسی ڈیموکریسی پر اکتفا نہیں کرنا ہے، ہمیں سیاسی ڈیموکریسی کو سماجی ڈیموکریسی میں تبدیل کرنا ہوگا، سیاسی ڈیموکریسی کا وجود سماجی ڈیموکریسی پر منحصر ہے۔ سماجی ڈیموکریسی کا کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب ہے ایک ایسا نظام زندگی جس میں آزادی (liberty)، مساوات (equality) اور اخوت (fraternity) کو اصول حیات کے طور پر تسلیم کیا گیا ہو۔

یعنی سیاسی ڈیموکریسی کے لیے سماجی ڈیموکریسی ناگزیر ہے، سماجی ڈیموکریسی نام ہے آزادی، مساوات اور اخوت کا، اور آزادی، مساوات اور اخوت کی بنیاد پر وہ مثالی سماج تشکیل پاتا ہے جو ذات پات اور برہمنواد سے پاک ہو۔ مطلب یہ ہوا کہ ڈیموکریسی کے قیام کے لیے ذات پات کا خاتمہ اور برہمنواد کا قلع قمع ضروری اور ناگزیر ہے۔ یہ ملک عوامی جمہوریہ (Democratic Republic) اسی وقت بنے گا جب یہاں

---

(۱) Constitution Assembly of India debate: V: X1. 25 Nov: 1949

کے سماجی ڈھانچہ سے برہمنیت کا خاتمہ ہوگا، ورنہ یہ ملک عوامی جمہوریہ(Democratic Republic)نہیں بنے گا، یہی بات امبیڈکر نے دستور کے نفاذ کے تین سال بعد 1953 میں بی بی سی کوانٹرویو دیتے ہوئے کہی تھی:

> ڈیموکریسی بھارت میں نہیں آئے گی، اس کا ایک واضح سبب ہے، وہ یہ کہ ہمارا سماجی ڈھانچہ مکمل طور پر پارلیمانی ڈیموکریسی کے خلاف ہے۔(۱)

☆ **عظمت(Dignity):**

تمہید کے کلیدی الفاظ میں ایک بہت اہم لفظ dignity کا ہے، جس کا ترجمہ عظمت یا وقار سے کیا جاتا ہے، اس لفظ کا اطلاق تمام بھارتیوں پر ہوتا ہے؛ مگر برہمنزم کی تاریخ پر نظر رکھنے والا اور امبیڈکر ودیگر سماجی انصاف تحریک کاروں اوران کے مہاپرشوں کے لٹریچر کا مطالعہ کرنے والا یہ لفظ پڑھتے ہی بے ساختہ کہے گا کہ یہ لفظ بھارت کے مظلوم ومحروم طبقات کے افراد کے لیے ہے، کیوں کہ یہی وہ لوگ ہیں جنھیں اس نعمت سے ماضی قدیم سے محروم رکھا گیا، امبیڈکر کی نظر میں یہ نعمت روٹی سے زیادہ قیمتی ہے، وہ لکھتے ہیں:

> The want and poverty which has been their lot is nothing to them as compared to the insult and indignity which they have to bear as a result of the vicious social order. Not bread but honour, is what they want. (۲)
>
> ضرورت اور محتاجگی جو کہ ان میں بہت زیادہ ہے، ان کی توہین اور بے توقیری کے مقابل کچھ نہیں ہے، جو انھیں شیطانی سماجی نظام کے نام پر سہنی پڑتی ہے۔ انھیں روٹی نہیں چاہیے؛ بلکہ عزت چاہیے۔

29 ستمبر 1934 کو ممبئی میں منعقد ایک اجلاس سے تفصیلی خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر امبیڈکر کہتے ہیں:

> ”آج ہندو(اونچی ذات کے) لوگ آپ کو پیر کے جوتے سے زیادہ نہیں سمجھتے، آپ کے ساتھ غلاموں جیسا سلوک کرنے کا ان کا پختہ عزم ہے، اگر ایسا ہے تو یہ ظلم آپ کتنے دن برداشت کریں گے؟ کیا آج کی صورت حال آپ کے سوابھیمان (عزت نفس) کو زیب دیتی ہے؟ سوابھیمان سے عاری غلام کیا

---

(۱)انٹرویو یوٹیوب پر موجود ہے۔

(۲) What Congress and Gandhi have done to the Untouchables, BAWS: V: 9, P:213

اپنے کو اور اپنے سماج کو ترقی دے پایا ہے؟ اس سوال پر آپ اچھی طرح سے
غور کر لیجیے، اپنے کو ہندو کہلانے کے عوض کیا آپ زندگی بھر غلام ہی رہنا پسند
کریں گے، اس سوال پر غور کرنے کے بعد میرا دل خود کو ہندو کہلانے کی
اجازت نہیں دیتا، گذشتہ دو سال سے میں اس سوال پر گہرائی سے غور کر رہا
ہوں، اور مجھے پورا یقین ہوتا ہے کہ اگر مجھے اپنا سوابھیمان زندہ رکھنا ہو،
مساوات کی فضا میں سانس لینا ہو تو میں خود کو ہندو نہیں کہلا سکتا''۔(۱)

اس اقتباس میں یہ واضح ہے کہ dignity سے محرومی شیطانی سماجی نظام منوواد کی بنیاد پر ہوئی، یعنی dignity کی بازیافت کے لیے منووادی سماجی نظام کے خلاف بغاوت کرنا ناگزیر ہے، گویا یہ لفظ بھی برہمنوادی غلامی کے خلاف برپا کیے گئے انقلاب کی طرف واضح اشارہ کرتا ہے؛ بل کہ منوواد سے آزادی کے بغیر یہ لفظ بے معنی ہے۔

☆ قوم(Nation):

اخیر میں ایک لفظ Nation (قوم) کا رہ جاتا ہے، اس کے ساتھ Unity (اتحاد) کا لفظ جڑا ہوا ہے، یہ دونوں الفاظ جب آپس میں مربوط ہوتے ہیں تو ان کا رشتہ سماجی انقلاب کے قیام اور ذات پات کے خاتمہ سے جڑتا ہے، اسے سمجھنے کے لیے امبیڈکر کی یہ عبارتیں ملاحظہ ہوں:

> In every Hindu the consciousness that exists is the consciousness of his caste. That is the reason why the Hindus cannot be said to form a society or a nation. There are however many Indians whose patriotism does not permit them to admit that Indians are not a nation, that they are only an amorphous mass of people. They have insisted that underlying the apparent diversity there is a fundamental unity which marks the life of the Hindus. (۲)

---

(۱) مجموعۂ مقالات وخطبات (ہندی): ڈاکٹر امبیڈکر، ج:38، ص:412

Annihilation of Caste. BAWS: V: 1, P: 51 (۲)

کسی بھی ہندو میں جو شعور پایا جاتا ہے وہ ذات کا شعور ہوتا ہے، اسی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندو اپنا سماج یا اپنی قوم نہیں بنا سکتے۔ بہت سے بھارتی ایسے ہیں جن کی حب الوطنی انھیں اس بات کا اعتراف کرنے کی اجازت نہیں دیتی کہ بھارتی لوگ کوئی قوم (Nation) نہیں ہیں؛ وہ تو صرف لوگوں کی بے ہنگم بھیڑ ہیں؛ مگر انھیں اس بات پر اصرار ہے کہ ہندوؤں میں واضح تنوع کے باوجود ایک بنیادی وحدت پائی جاتی ہے جو ان کی زندگی کو نمایاں کرتی ہے۔

This anti-social spirit, this spirit of protecting its own interests is as much a marked feature of the different castes in their isolation from one another as it is of nations in their isolation. (۱)

ایک دوسرے سے علیحدہ رہنے کی جو خصوصیت قوموں (Nations) کی ہوتی ہے اس سماج مخالف رجحان اور اپنے ہی مفادات کے تحفظ کے رجحان کی وجہ سے وہی نمایاں خصوصیت مختلف ذاتوں کو حاصل ہے۔

There is no doubt, in my opinion, that unless you change your social order you can achieve little by way of progress. You cannot mobilize the community either for defence or for offence. You cannot build anything on the foundations of caste. You cannot build up a nation, you cannot build up a morality. Anything that you will build on the foundations of caste will crack and will never be a whole. (۲)

میرے خیال میں جب تک آپ اپنا سماجی ڈھانچہ تبدیل نہ کرلیں آپ بلاشبہ کچھ زیادہ پیشرفت نہیں کرسکتے ہیں، آپ سماج کو نہ دفاع کے لیے جمع کرسکتے ہیں اور نہ اقدام کے لیے، آپ ذات پات کی بنیادوں پر کچھ بھی تعمیر نہیں کرسکتے

Ibid: 52 (۱)

Ibid: 66 (۲)

ہیں،آپ نہ قوم(Nation) کی تعمیر کر سکتے ہیں اور نہ ہی اخلاقیات کی،ذات کی بنیادوں پر جو عمارت بھی آپ کھڑی کرنا چاہیں گے وہ دھڑام سے زمین پر آ گرے گی،وہ کبھی پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ پائے گی۔

قوم کے اتحاد(Unity of Nation) کے لفظ کو ذات پات کے خاتمہ اور برہمنیت کے خلاف بغاوت سے جوڑنا شاید کسی کو زبردستی کی تاویل لگے؛مگر یہ حقیقت ہے کہ امبیڈکر کی نظر میں ذات پات کا وجود Nation(قوم) کی تشکیل میں رکاوٹ ہے،ہر ذات اپنے آپ میں مستقل ایک Nation ہے،جب تک ذات پات اور برہمنیت کا خاتمہ نہیں ہوجاتا بھارت کے لوگ حقیقی معنوں میں ایک Nation نہیں کہلائے جاسکتے،یہی وجہ ہے کہ دستور کے آغاز میں مذکور The people of India(بھارت کے لوگ) والی تعبیر پر جب بعض لوگوں نے اعتراض کیا اور The Indian nation(بھارتی قوم) لکھنے کے لیے کہا تو امبیڈکر نے انہیں یہی جواب دیا کہ بھارتیوں کا اپنے آپ کو ایک قوم nation سمجھنا فریب خوردگی کے سوا کچھ نہیں۔ دستور ساز اسمبلی کی اپنی آخری تقریر میں ڈاکٹر امبیڈکر کہتے ہیں:

> I remember the days when politically-minded Indians, resented the expression "the people of India". They preferred the expression "the Indian nation." I am of opinion that in believing that we are a nation, we are cherishing a great delusion. How can people divided into several thousands of castes be a nation? The sooner we realize that we are not as yet a nation in the social and psychological sense of the world, the better for us. .... In India there are castes. The castes are anti-national. In the first place because they bring about separation in social life. They are antinational also because they generate jealousy and antipathy between caste and caste. But we must overcome all these difficulties if we wish to become a nation in reality. For fraternity can be a fact only when there is a nation. (۱)

---

(۱) Constitution Assembly of India debate: V: X1. 25 Nov: 1949

''مجھے وہ دن یاد ہیں جب سیاسی ذہن کے بھارتیوں نے ''بھارت کے لوگ'' کی تعبیر پر ناراضگی جتائی، ان کا کہنا تھا کہ ''بھارتی قوم'' کی تعبیر درج کی جائے۔ میری رائے یہ ہے کہ ہم لوگوں کا اپنے آپ کو ایک قوم سمجھنا ایک بڑے فریب میں گرفتار ہونا ہے۔ ہزاروں ذاتوں میں منقسم لوگ کیسے ایک قوم بن سکتے ہیں؟ جتنا جلد ہم اس کا ادراک کرلیں کہ دنیا کے سماجی اور نفسیاتی مفہوم کے اعتبار سے ہم ایک قوم نہیں ہیں اتنا ہمارے حق میں بہتر ہوگا..... بھارت میں ذات پات ہے، ذات پات کا نظام anti-national (قوم دشمن) ہے، کیونکہ وہ سماجی زندگی میں علیحدگی پیدا کرتا ہے، یہ anti-national (قوم دشمن) اس لیے بھی ہے کہ اس سے ذاتوں کے درمیان حسد اور حقارت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔لیکن ہمیں حقیقی معنوں میں ایک nation (قوم) بننے کے لیے ان تمام مشکلات پر قابو پانا ہوگا''۔

تمہید (Preamble) کے افتتاحی الفاظ We the people of India (ہم بھارت کے لوگ) کو آخری الفاظ Unity of Nation (قوم کے اتحاد) سے مربوط کریں گے تو اس کا یہ مطلب نکلے گا کہ یہ دیش ابھی ذات پات اور برہمنواد کا شکار ہے، اس لیے امبیڈکر نے the Indian nation (بھارتی قوم) نہیں کہا، مگر اس ملک کو ذات پات اور برہمن واد سے آزاد کرنا ہے اس لیے اخیر میں قوم کے اتحاد Unity of Nation کا عہد لیا گیا، اور درمیان میں ان قدروں اور اصولوں کا ذکر کیا گیا ہے جن سے ذات پات کا خاتمہ ہو اور برہمنواد سے آزادی حاصل ہو اور جن کی بنیادوں پر ذات پات سے پاک سماج اور برہمنواد سے آزاد دیش تشکیل پذیر ہو۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم اس بات کو سمجھ پائے کہ یہ دستور جہاں برطانوی غلامی سے آزادی کے بعد مملکتی نظم ونسق کے لیے لکھا گیا ایک ہدایت نامہ ہے وہیں اس سے کہیں زیادہ یہ برہمنوادی غلامی سے آزادی کی دستاویز ہے اور خاص کر اس کی تمہید منووادی نظام کے خلاف انقلاب کا عہد نامہ ہے؟ کیا ہم نے سیاسی، سماجی اور معاشی ہر اعتبار سے اس ملک میں مساوات قائم کرنے میں کامیابی حاصل کرلی یا ہم ابھی تضادات والی وہ زندگی گذار رہے ہیں جس کی طرف امبیڈکر نے دستور ساز اسمبلی کی اپنی آخری تقریر میں اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا:

On the 26th of January 1950 we are going to enter into a life of contradictions. In politics we will have equality and in social and economic life we will have inequality. In politics we will be recognizing the principle of one man one vote and one vote one value. In our social and economic life, we shall, by reason of our social and economic structure, continue to deny the principle of one man one value. How long shall we continue to live this life of contradictions? How long shall we continue to deny equality in our social and economic life? If we continue to deny it for long, we will do so only by putting our political democracy in peril. (۱)

''ہم 26 جنوری 1950 کو تضادات والی زندگی میں داخل ہونے جارہے ہیں، سیاست میں ہمیں مساوات حاصل ہوگی، جب کہ سماج اور معیشت میں ہمیں مساوات حاصل نہیں ہوگی۔ سیاست میں ہم ''ایک آدمی ایک ووٹ اور ایک ووٹ ایک قدر''(۲) کے اصول کو تسلیم کرلیں گے؛ جب کہ سماج اور معیشت میں ہمارے سماجی اور معاشی ڈھانچہ کی وجہ سے ہم ''ایک آدمی ایک قدر'' کے اصول کو تسلیم نہیں کریں گے، ہم کب تک سماج اور معیشت میں برابری اور مساوات کا انکار کریں گے؟ اگر ہم لمبے عرصے تک اسے نظر انداز کرتے رہے تو ہم ایسا صرف سیاسی جمہوریت کو خطرہ میں ڈال کر ہی کر پائیں گے''۔

خلاصہ یہ کہ تمہید میں مذکور کلیدی الفاظ میں سے صرف ایک لفظ سَوَرَنْ Sovereign (مقتدر اعلی) کا لفظ برطانوی استعمار سے آزادی کی طرف اشارہ کرتا ہے، باقی کلیدی الفاظ منوواد کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کی کوششوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں، یعنی یہ تمہید جہاں اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ یہ ملک اب انگریزوں کا غلام نہیں رہا وہیں اس سے کہیں زیادہ اس بات کی طرف توجہ دلاتی ہے کہ دیش میں سماجی

(۱) Constitution Assembly of India debate: V: X1. 25 Nov: 1949

(۲) یعنی سارے انسان بحیثیت انسان برابر ہیں۔

انقلاب کو مکمل طور پر بر پا کیا جائے اور ذات پات اور منوواد سے پاک مساوات پر مبنی مثالی سماج کی تشکیل کی جائے۔ یہ ملک عوامی جمہوریہ (Democratic Republic) اسی وقت بنے گا جب یہاں کے سماجی ڈھانچہ سے برہمنیت کا خاتمہ ہوگا، ورنہ یہ ملک عوامی جمہوریہ نہیں بنے گا۔

سوال یہ ہے کہ کیا ہم برطانوی غلامی سے آزادی کے پچہتر (75) سال بعد بھی دیش کی اس دوسری غلامی کا ادراک کر پائے یا ہم برطانوی استعمار سے آزادی کی خوشی میں ہی مگن ہیں؟

○○○

زیر تعمیر آڈیٹوریم، لائبریری اور دار التربیہ کا مجوزہ نقشہ

معہد کا خوبصورت پارک

RNI No: 1219775, RNI Tile-Code: APURD01946